فہرست

مضمون نگارانِ معارف

جلد ۱۳۶

ماہ جولائی ۱۹۸۵ء تا ماہ دسمبر ۱۹۸۵ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست مضامین معارف

جلد ۱۳۶

ماہ جولائی ۱۹۸۵ء تا دسمبر ۱۹۸۵ء

(بترتیب حروف تہجی)

جلد ۱۳۶ ماہ شوال المکرم ۱۴۰۵ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۸۵ء عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

گذشتہ مہینہ معارف کے شذرات میں مسلمانوں کی مطلقہ عورتوں کو نان نفقہ دینے کے فیصلہ اور کلکتہ ہائی کورٹ میں قرآن مجید کی اشاعت پر پابندی لگانے کی درخواست کے دو دھماکوں کا ذکر آیا تھا۔ اب تیسرا دھماکا اتر پردیش کی حکومت کے ایک وزیر کا وہ بیان ہے جو صرف اس ریاست کی اردو اکاڈمی کے عہدیداروں بلکہ اردو بولنے والوں کے لیے بھی نہایت اہانت آمیز سمجھا جارہا ہے، ان تمام دھماکوں سے مسلمانوں کو ذہنی اور نفسیاتی طور پر مجبور کیا جارہا ہے کہ وہ سوچیں کہ وہ اپنی مذہبی حمیت، ملی غیرت اور لسانی خودداری کو برقرار رکھ کر اس ملک میں کس طرح باعزت اور باوقار زندگی بسر کر سکتے ہیں، جو ان کے دستوری اور جمہوری حقوق کا لازمی جزہے، لیکن ملکی مفاد کی خاطر یہ بھی سوچنا ضروری ہے کہ ایسے اقدام اور بیانات ملک کے لیے کہاں تک مفید ہیں؟

اس وقت پنجاب جوالا مکھی بنا ہوا ہے، کشمیر میں بڑی بے چینی ہے، آسام میں برسوں سے بغاوت ہے، تری پورہ اور میزورام درد سر ہیں، گجرات میں خون کی ہولی کھیلی جارہی ہے، جنوبی ہند اور مرکزی حکومت میں بے اعتمادی اور لا اعتباری کی خلیج حائل ہے، اونچی ذات اور ہریجنوں میں سخت آویزش ہے، جابجا بلوے فسادات ہوتے رہتے ہیں، اونچی ذات کے ہندوؤں کے مختلف گروہوں کے باہمی نفاق سے حکومت کی کارکردگی میں جو انتشار پھیلا ہوا ہے اس پر پردہ نہیں ڈالا جاسکتا ہے، ان ناسازگار حالات میں مسلمانوں اور اردو بولنے والوں کے ذہن اور دماغ پر ایٹم بم گرا کر ان کو ہیروشیما اور ناگاساکی بنا دینے کی کوشش کہاں تک صحیح ہے؟

یہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ نیشنلزم کے نام پر ہی کیا جارہا ہے، نیشنلزم ملک کی قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی کے لیے بہت ضروری ہے، اس میں عاقبت اندیشانہ روشن ضمیری، مصالحانہ فراخدلی اور

مدبرانہ رواداری ہو تو یہ ملک کے لیے رحمت ہے، اور اسی سے ہندوستان جنت نشان بن سکتا ہے، لیکن جب یہ بگڑ جائے اور اس میں جارحیت، سامراجیت اور فرعونیت پیدا ہو جائے تو یہ ملک کے لیے رحمت کے بجائے اذیت ہے، اس سے بیزار ہو جانے والوں کو شورش پسند، شرانگیز، ملک دشمن اور غیر وفادار قرار دے کر ان کو دبا کر رکھنا اچھی نیشنلزم اور حکمرانی کی دلیل نہیں، دلوں کو تسخیر کر کے ان پر حکومت کرنے ہی میں اچھی نیشنلزم اور حکمرانی کا ثبوت دیا جاسکتا ہے۔

اردو ملک کے دستور میں ایک تسلیم شدہ زبان ہے، یہ صحیح ہے کہ یہ کسی علاقہ کی اکثریت کی زبان نہیں، انگریزی بھی یہاں کسی علاقہ کی زبان نہیں، مگر اس کو ہمارے ملک کے اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور سرکاری دفتروں میں اپنے حق سے زیادہ باعزت جگہ دی جارہی ہے محض اس لیے کہ یہ ایک بین الاقوامی زبان ہے، اگر تعصب کی عینک آنکھوں پر نہ ہو تو اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اردو ملک گیر، یعنی آل انڈیا بلکہ بین الملکی زبان نہیں ہے، اب تو اس میں بین الاقوامیت بھی پیدا ہو رہی ہے، اور سب سے بڑھ کر تو یہ ہندو مسلمان کے میل ملاپ کی زبان ہے، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ انگریزی زبان نے ہمارے ملک کو اونچا کیا ہے تو اردو نے اس کو مہذب بنایا ہے، انگریزی زبان یہاں معزز جگہ پا سکتی ہے تو پھر اردو اس سے زیادہ باعزت جگہ پانے کی مستحق ہے۔

اردو بولنے والوں کے مطالبات کو غیر معمولی بلکہ حقارت آمیز اعصابی جنگ کے ذریعہ جس طرح اب تک ٹھکرایا گیا ہے، اس کا نفسیاتی تجزیہ بھی کرنے کی ضرورت ہے، اس سلسلہ میں ہمارے وطن کے بہت بڑے سیکولرسٹ اور محب وطن رہنما مولانا ابوالکلام آزاد ہماری رہنمائی کر چکے ہیں، ۱۹۵۲ء میں لوک سبھا میں ہندی کے بڑے پریمی پرشوتم داس ٹنڈن نے ان پر اردو نوازی کا الزام رکھا تو انھوں نے اسی ایوان میں ایک بہت ہی پرزور اور جاندار تقریر میں فرمایا کہ اردو زبان کسی ایک مذہبی گروہ کی زبان نہیں ہے، اس کے بولنے والوں میں ہندو بھی ہیں مسلمان بھی ہیں عیسائی بھی ہیں اور سکھ بھی ہیں، اور مان لیجیے کہ صرف مسلمان ہی اردو بولتے ہیں،

گو کہ یہ صحیح نہیں، پھر بھی جو کروڑوں مسلمان یہاں بستے ہیں ان کی خاطر اس زبان کی کوئی خدمت کی جائے تو کون ایسی چیز ہے جس کو بہت زیادہ محسوس کیا جائے۔

اسی سلسلہ میں مولانائے محترم نے یہ بھی فرمایا کہ جو لوگ اردو کی مخالفت کرتے ہیں وہ اس لیے نہیں کرتے کہ ان کو ہندی سے محبت ہے بلکہ اس لیے کہ وہ یہ نہیں دیکھنا چاہتے کہ کوئی اور دوسری زبان بڑھے، یہ جذبہ صحیح نہیں، ہندی بولنے والے زیادہ سے زیادہ اپنے بند کو اونچا کر لیں لیکن وہ کیوں چاہتے ہیں کہ دوسرا ٹھگنا ہو جائے، انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ جہاں تک ہندی کا تعلق ہے کوئی ایک آدمی بھی شمالی ہند میں ایسا نہیں ہے جو ہندی کی ترقی نہ چاہتا ہو، یا ہندی کا مخالف ہو، جو لوگ ہندی نہیں جانتے وہ بھی اپنے بچوں کو ہندی پڑھا رہے ہیں مگر ہندی کی ترقی کے راستہ میں کوئی رکاوٹ ہے تو ایسے دماغوں کی طرف سے ہے جو دوسری زبانوں کو آگے بڑھنے کا موقع دینا نہیں چاہتے، بلکہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ وہ باقی نہ رہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہندی کی ترقی نہیں چاہتے بلکہ دوسری زبانوں کی گراوٹ چاہتے ہیں، یہ جذبہ غلط ہے، پھر اسی تقریر کو ختم کرتے ہوئے بڑی آزردگی کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ میں بہت صاف صاف کہوں گا کہ ہندوستان پر جو مصیبت ٹو نیشن تھیوری کی آئی یا پاکستان بنانے کے پوائنٹ آف ویو اور پاکستان بننے کی جو مصیبت آئی اس کی جتنی ذمہ داری گمراہ مسلمانوں اور مسلم لیگ پر ہے اتنی ہی ذمہ داری اس طرح کے دماغوں پر بھی ہے؟

ان دلائل سے ہمارے وطن کا وہ طبقہ ضرور متاثر ہوگا جو سیکولرزم، قومی یکجہتی اور وطن دوستی کا قائل سچے دل سے ہے، ایسے ہی فراخ دل محبان وطن کی نیشنلزم سے ہمارے ملک میں محبت کی گنگا، یگانگت کی جمنا اور موانست کی برہم پتر بہنے کی امید ہے، مگر اسی ملک میں ایک انتہا پسند، تنگ نظر اور ناعاقبت اندیش طبقہ ایسا بھی ہے جو ہندوستان کو ہندو استھان تصور کرتا ہے، اس کی نیشنلزم کا تخیل یہ ہے کہ یہاں غیر ہندو اسی کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرنے پر اکتفا کریں، اگر وہ بھکاری بن کر کبھی بھیک مانگیں تو ان کی نزاری اور بے مقداری کے پیالہ میں جو کچھ ڈال دیا جائے اسی پر قناعت کریں، سوچنا یہ ہے کہ کیا ایسی ہی نیشنلزم میں وطن کا مفاد ہے جس سے تفرقہ کا سیلاب، اختلاف کا طوفان اور نفاق کا جھکڑ امنڈ پڑنے کا خطرہ ہو؟۔

مقالات

سر سید احمد خان اور مستشرقین

از

عبید اللہ کوٹی ندوی رفیق دار المصنفین

(۶)

سر سید احمد خان ناسخ و منسوخ کی تشریح کرتے ہوئے یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ عیسائی عالموں نے ان لفظوں کی حقیقت سمجھنے میں غلطی کی ہے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ناسخ آیتوں نے منسوخ آیتوں کو اس وجہ سے کہ ان میں کچھ نقص یا کسی قسم کا اشتباہ تھا، بیکار کر دیا ہے، مگر ان کا یہ خیال غلط ہے، مسلمانوں میں تو اس بات پر ایمان رکھنا ایک مذہبی فریضہ ہے کہ خدا تعالیٰ علام الغیوب ہے، یعنی اس کو ماضی، حال اور مستقبل کا یکساں علم ہے، اس لیے اگر یہ سمجھا جائے کہ خدا تعالیٰ کے پہلے حکم میں کوئی نقص تھا جو بعد کو ظاہر ہوا اور پھر دوسرا حکم دیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا تعالیٰ کے کمال علمی میں نقص تھا، اور ایسا عقیدہ اسلام کی رو سے کفر ہے، اس لیے مسلمانوں میں ناسخ و منسوخ کا مطلب وہ نہیں ہے جو عیسائی علماء سمجھتے ہیں۔

ناسخ و منسوخ کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ زمانہ اور حالات میں تبدیلی کی وجہ سے انبیاء کی شریعتوں میں بھی تبدیلی کی گئی، جس کی مثالیں بائبل میں بھی ملتی ہیں، مثلاً حضرت موسیٰ کی شریعت سے پہلے

ایک مرد اپنی بیوی کی زندگی میں اس کی بہن یعنی اپنی سالی سے شادی کر سکتا تھا، حضرت موسیٰؑ نے اس حکم کو منسوخ کر دیا، اور فرمایا کہ کوئی آدمی اپنی بیوی کی زندگی میں اس کی بہن سے شادی نہیں کر سکتا، لیکن اس کے مرنے کے بعد کر سکتا ہے، حضرت موسیٰؑ نے مرد کو کامل اختیار دیا تھا کہ جب چاہے اپنی بیوی کو طلاق دے دے، اور گھر سے باہر نکال دے، اس حکم کو بقول عیسائیوں کے حضرت عیسیٰؑ نے تبدیل کر دیا اور حکم دیا کہ مرد اپنی بیوی کو کسی صورت سے طلاق نہیں دے سکتا جب تک کہ اس نے کسی سے زنا نہ کیا ہو، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی طلاق دینے کو مرد کے اختیار میں رکھا، لیکن یہ قید لگائی کہ اگر کسی شدید ضرورت اور معقول وجہ کے بغیر شوہر طلاق دے گا تو وہ ایک گناہ کا مرتکب ہوگا، ناسخ و منسوخ کی اس تشریح کی روشنی میں قرآن مجید کی آیتوں پر لفظ منسوخ کا اطلاق نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس کے بعد کوئی ایسی شریعت نازل نہیں ہوئی اور نہ نازل ہوگی، البتہ پچھلی شریعتیں منسوخ ہوئیں، مگر اس مفہوم میں نہیں جو عیسائیوں کے یہاں جانا جاتا ہے، یعنی خدا کے علم میں تغیر یا نقص واقع نہیں ہوا، بلکہ نئے حالات اور نئی ضرورتوں کی وجہ سے اس نے نیا حکم دیا، اور پچھلی شریعت خدا کے علم میں پچھلے زمانہ ہی کے لیے تھی، قرآن مجید کی آیت (مَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ...... مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَۃٍ اَوْ نُنْسِھَا... قَدِیْرٌ - بقرہ: آیت ۹۹ - ۱۰۰) سے کسی طرح یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ قرآن مجید کی ایک آیت دوسری آیت کو منسوخ کرتی ہے، بلکہ اس میں صاف طور پر اہل کتاب کا ذکر ہے، جن کی شریعت کے احکام میں شریعت محمدی سے کسی قدر کمی و بیشی ہو گئی ہے، ان کے بارے میں خدا نے فرمایا کہ ہم جس آیت یعنی اہل کتاب کی شریعت کے کسی حکم کو منسوخ کرتے یا بھلاتے ہیں تو اس سے بہتر یا اسی کے مانند حکم بھیج دیتے ہیں۔

ناسخ و منسوخ کے دوسرے معنی ایک فقہی اصطلاح کے طور پر ہیں اور فقہاء کی اس اصطلاح کا اطلاق قرآن و حدیث پر بھی ہوتا ہے، لیکن اس مفہوم میں نہیں جو عیسائی سمجھتے ہیں، قرآن مجید اور

احادیث نبوی میں ایسے احکام ہیں جن کا تعلق ایک ہی معاملہ سے ہے، مگر وہ احکام مختلف حالات اور مواقع پر صادر ہوئے ہیں، جب وہ حالت باقی نہیں رہتی تو اس حکم کی تعمیل واجب نہیں رہتی اور دوسرا حکم جو تبدیل شدہ حالت کے مطابق ہو، نافذ ہو جاتا ہے، اگرچہ پہلے حکم کو منسوخ اور دوسرے کو ناسخ کہیں گے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر پہلی حالت پھر واپس آ جائے تو اس کا حکم بھی دوبارہ نافذ کرنا ہوگا، نہ کہ دوسرا حکم، مثلاً جب شراب کی ممانعت ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سبز رنگ کے پیالوں کے استعمال کو بھی جن کا خاص طور پر عربوں میں رواج تھا ممنوع قرار دیا، مگر جب یہ حکم سب لوگوں کو معلوم ہو گیا اور شراب پینے کا رواج بھی ختم ہو گیا تو آپ نے ان پیالوں کے استعمال کی اجازت دے دی، اسی طرح جب مکہ میں کفار قریش کی حکومت تھی اور مسلمان محکوم تھے تو مسلمانوں کو ہر قسم کی تکلیفوں اور سختیوں کو صبر اور استقلال کے ساتھ برداشت کرنے کا حکم دیا گیا، اور جب یہ مسلمان دوسرے ملک چلے گئے تو اس وقت جہاد کے احکام دیے گئے، ان دونوں مثالوں میں پہلے حکم کو منسوخ اور دوسرے حکم کو ناسخ کہیں گے، یہ فقہاء کی اصطلاح ہے، لیکن اگر پہلے والے حالات دوبارہ پیش آئیں تو وہ حکم بھی دوبارہ نافذ ہو جائے گا، جسے فقہاء نے منسوخ کہا ہے، اور ناسخ پر عمل درآمد نہ ہوگا۔

ان بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ یہ الفاظ صرف اصطلاحات ہیں، جو علماء نے مقرر کی ہیں، محققین علمائے اسلام کا عقیدہ ہے کہ ناسخ و منسوخ کے الفاظ اپنے اصلی اور لغوی معنوں میں قرآن مجید کی نسبت استعمال نہیں کیے گئے، عمرو بن شعیبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں کو سنا کہ قرآن مجید میں جھگڑا کرتے ہیں، تو فرمایا کہ تم سے پہلے جو لوگ ہلاک ہوئے وہ اس لیے کہ انھوں نے خدا کی کتاب کے ایک حصہ کو دوسرے حصہ سے لڑایا، (رد کیا) خدا کی کتاب تو اس لیے اتری ہے کہ بعض سے بعض کی تصدیق ہو، پس

بعض کی بعض سے تکذیب مت کرو، اس میں سے جو جانو وہ کہو، اور جو نہ جانو اس کو اس کے واقف کار پر چھوڑ دو۔ (مسند احمد و ابن ماجہ) (خطبات احمدیہ: ص ۴۲ - ۴۳۲)

سر ولیم میور نے یہ جو لکھا ہے کہ "قرآن میں کم سے کم دو سو پچیس آیتیں منسوخ ہیں" یہ محض بے سند خیال ہے، البتہ یہ ممکن ہے کہ نزول قرآن کے دور اول میں کچھ لوگوں نے اپنی غلطی سے قرآن و حدیث میں تمیز نہ کی ہو، بہت سی حدیثوں کو غلطی سے قرآن کا جزو سمجھ لیا ہو، اور قرآن مجید میں وہ حصے نہ پاکر یہ گمان کیا ہو کہ بعض آیتیں منسوخ ہو گئی ہیں، اور قرآن مجید میں مندرج نہ ہوئیں، مگر ظاہر ہے کہ ایسا خیال جس کو ہوا، خود اس کی غلطی ہے۔ (ایضاً ص ۴۴۷)

سر ولیم میور نے آیتوں کے منسوخ ہونے کے بارے میں جو طویل بحث کی ہے وہ قواعد اسلام کی رو سے درست نہیں ہے، اور اس کی تائید میں کوئی شہادت بھی نہیں ہے، مثلاً ان کا بیان ہے کہ "اکثر حصہ قرآن کا صرف عارضی مقصد کے لیے تھا جو عارضی حالات کی وجہ سے سامنے آیا، اور جن کی عظمت بہت جلد جاتی رہی، یہ بات مشتبہ معلوم ہوتی ہے کہ پیغمبر صاحب کے نزدیک اس قسم کی آیتوں سے ان کی عام عظمت یا ان کو رائج کرنا مقصود تھا یا نہیں، قرینہ سے تو یہ بات معلوم نہیں ہوتی کہ ان حصوں کی حفاظت کی انھوں نے کوشش کی ہو"

سر ولیم کسی دلیل یا شہادت کے بغیر کہنا یہ چاہتے ہیں کہ قرآن مجید میں کچھ حصے ایسے بھی شامل ہو گئے ہیں جن کی حیثیت عارضی تھی یعنی وہ منسوخ ہو چکے ہیں، لیکن بقول سر سید احمد خان: "یہ غلطی جو سر ولیم میور کو ہوئی اکثر عیسائی مصنفوں کو لفظ منسوخ کے معنی نہ سمجھنے کے سبب یا غلط معنی سمجھنے کی وجہ سے ہوئی ہے، اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ لفظ منسوخ کے جو معنی عیسائی مصنف سمجھتے ہیں ان معنوں میں قرآن مجید کی کوئی آیت بھی منسوخ نہیں ہے، اور اگر اس لفظ کے وہ معنی لیے جائیں جس میں مسلمان فقہاء نے اس لفظ کو اصطلاحاً استعمال کیا ہے تب بھی کوئی آیت (عارضی مدت یا) محدود

مقصد کے لیے قرآن مجید میں موجود نہ تھی، اور سب سے دائمی ترویج مقصود تھی۔"

(خطبات احمدیہ ص ۴۶۹)

قرآن مجید اور حضرت عثمانؓ

مسٹر گاڈفری ہیگنز عموماً قرآن، اسلام اور سیرت رسول ﷺ کے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں، مگر وہ اپنے اچھے خیالات کے باوجود ایک جگہ قرآن کے بلند اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے ایک جملہ یہ بھی لکھ جاتے ہیں کہ "یہ امر اس کے (یعنی قرآن مجید کے) مصنف کی لازوال نیک نامی کا سبب ہے، خواہ وہ محمد عرب کے نامی پیغمبر ہوں، یا اس کے تیسرے خلیفہ عثمان"۔ (خطبات احمدیہ: ص ۴۶۳) یہ ایک ایسی رائے ہے جو قرآن کے بارے میں دانستہ طور پر غلط بیانی کہی جا سکتی ہے، اور غلط فہمی پھیلانے کے لیے لکھی گئی ہے، قرآن کے صفحات گواہ ہیں کہ اس کا مصنف کون ہے، اور تاریخ سے بھی یہی ثابت ہے، حضرت عثمانؓ کے پاس تلاوت کے لیے جو قرآن تھا وہ وہی تھا جو تمام مسلمانوں کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر خدا کی طرف سے اتارا گیا، اور جسے تمام صحابۂ رسول کے اتفاق سے اور ان کی نگرانی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت اور رہنمائی کے مطابق اسی ترتیب کے مطابق جو مسلمانوں میں پہلے سے معروف تھے، اور جس کو قرآن کے حافظ اپنے سینوں میں اسی کے مطابق پاتے تھے، ایک جلد میں اکٹھا کیا گیا تھا، اور حضرت عثمانؓ نے اسی کی نقلیں دنیائے اسلام میں بھجوا دی تھیں، اس لیے گاڈفری ہیگنز کا یہ الزام غلط بیانی کی ایک بری اور افسوسناک مثال ہے، پیغمبر صاحب قرآن کے مصنف نہ تھے، مسیحی علماء قرآن کی الہامی حیثیت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، مگر ان میں جو اہل انصاف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ قرآن کا ایک ایک لفظ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس کا سرچشمہ وہی ہے جو تورات و انجیل کا ہے اور قرآن کی زبان اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کی زبانوں میں جو فرق ہے، قرآن کا جو دعویٰ ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا چالیس برس تک اس کے علوم و معارف سے

ناواقف رہنا، آپؐ کا امی ہونا، قرآن کی فصاحت، اس کا اسلوب بیان اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کا انداز تخاطب، یہ تمام باتیں اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ قرآن اپنے لفظ و معنی دونوں میں خدا کی طرف سے ایک ہدایت نامہ ہے، مگر تعصب اور جہالت کا کوئی علاج نہیں۔

(خطبات احمدیہ ص ۲۱ - ۴۲۴ وغیرہ)

قرآن کی فصاحت اور صحیفۂ ایوب، گبن کا اعتراض

گبن نے اپنی تاریخ میں ایک بات یہ لکھی ہے کہ "قرآن کے بلند ترین خیالات صحیفۂ ایوب کی شان دار سادگی کے سامنے جو اسی ملک میں اور اسی زبان میں بہت مدت پہلے لکھا گیا تھا پست ہیں"۔ لیکن سرسید احمد خان کے بقول گبن میں اس قدر علمی قابلیت اور صلاحیت نہیں ہے کہ وہ قرآن مجید اور صحیفۂ ایوب کا باہمی فرق بتا سکیں:

"ہم کسی اعتراض کا اندیشہ کیے بغیر یہ کہہ سکتے ہیں کہ نہایت ذی علم عربی دانوں نے قرآن مجید کو فصاحت و بلاغت میں بے مثل قرار دیا ہے اور اس بات پر متفق ہیں کہ کوئی تحریر اس سے فائق نہیں، نہ پہلے اور نہ اس کے بعد، لبید جیسا بڑا شاعر قرآن مجید کی سورۂ بقرہ کی چند آیتوں کو سن کر حیرت زدہ رہ گیا، اور اس کی بلاغت کو انسانی قوت سے برتر ہونے کا اقرار کیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو قبول کر لیا، مسٹر کارلائل کا بیان ہے کہ سب سے اول اور سب آخر جو بھی خوبیاں ہیں وہ قرآن میں موجود ہیں، وہ ہر قسم کے اچھے اوصاف کا بانی ہے، بلکہ درحقیقت ہر قسم کے وصف اور خوبی کی بنا صرف اسی سے ہو سکتی ہے" (ایضاً ص ۴۶۲)

سرسید نے مسٹر سیل کا یہ اعتراف بھی نقل کیا ہے کہ "یہ بات مسلم ہے کہ قرآن قریش کی زبان میں جو اقوام عرب میں شریف ترین اور مہذب ترین قوم ہے، نہایت لطیف اور پاکیزہ زبان میں لکھا گیا ہے، وہ بے شبہ عربی زبان کا نمونہ ہے، اس کتاب سے بھی ثابت ہے کہ کوئی انسان

اس کا مثل نہیں لکھ سکتا وہ لازوال معجزہ ہے جو مردہ کے زندہ کرنے سے بڑھ کر ہے اور تمام دنیا کو اپنے بارے میں رب کی طرف سے ثبوت دینے کے لیے اکیلا کافی ہے، اس کتاب کی خوبی تحریر کی ان لائق لوگوں نے تعریف کی جن کا اس کام میں مبصر ہونا تسلیم کیا جاتا ہے، جس کی بے شمار مثالوں میں سے ایک مثال یہ ہے کہ لبید بن ربیعہ کا ایک قصیدہ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں سب بڑے زبان آوروں میں تھا، خانہ کعبہ کے دروازہ پر چسپاں تھا (جو عربوں میں کسی اعلیٰ تصنیفی کارنامہ کے لیے ایک بڑی عزت کی بات تھی) کسی شاعر کو اس کے مقابلہ میں اپنی کسی تصنیف کو پیش کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی لیکن کچھ دنوں کے بعد قرآن کی دوسری سورۃ کی چند آیتیں کسی نے اس کے مقابلہ میں لگا دیں تو خود لبید (جو اس زمانہ میں مشرکوں میں تھا) شروع ہی کی آیت پڑھ کر حیرت زدہ رہ گیا، اور فوراً مذہب اسلام کو قبول کر لیا، اور اس نے یہ بیان کیا کہ ایسے الفاظ صرف نبی ہی کی زبان سے برآمد ہو سکتے ہیں، یہ کسی انسان کا کلام نہیں۔ (خطبات احمدیہ ص ۵ - ۴۶۴)

قرآن مجید کے ساتھ ناشائستہ طرز عمل

یورپ کی زبانوں میں عیسائیوں نے قرآن مجید کے جو ترجمے کیے گا ڈفری ہگنز کا تبصرہ ان کی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کافی ہوگا، وہ لکھتا ہے کہ:

"اگر عبرانی توریت کا ترجمہ اس طرح شایع ہوتا کہ ہر لفظ کو متین اور شائستہ معنی کے بجائے ذلیل اور غیر مہذب معنی میں بدل دیا جاتا اور ہر آیت کا مضمون، جوڑ توڑ نا قابل برداشت غلط ترجموں اور غلط تاویلوں کے ساتھ مصنف کے سر معیوب معنی ڈالنے کا ذریعہ بنایا جاتا اور ایک بے قدر اور خراب شرح اس کے ساتھ لگی ہوتی تو اس ذریعہ کا کسی قدر تصور کیا جا سکتا ہے جس کے ساتھ یورپ میں قرآن مجید کی اشاعت ہوئی" (ایضاً: ص ۴۶۶)

مگر اسی کے ساتھ سرسید احمد خان چند عیسائی مصنفوں خصوصاً مسٹر سیل کے ممنون ہیں جنھوں نے بڑی کوشش سے قرآن مجید کا انگریزی میں ترجمہ کیا، اور اگرچہ وہ کہیں کہیں صحیح اور غلط تفسیر میں تمیز قائم

رکھنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوئے تاہم ان کی کوشش قابل قدر ہے۔

بے سروپا حکایات ان عیسائی عالموں اور مستشرقوں نے عجیب عجیب خیالات جن کی کچھ بنیاد نہیں قرآن مجید کی نسبت ظاہر کیے ہیں، چنانچہ ہمفری پرویڈو ڈین آف نارویچ نے لکھا ہے کہ :

> "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) لوگوں کو سکھلاتے تھے کہ اس کتاب کا اصلی نسخہ آسمانی دفتر میں رکھا ہوا ہے، اور جبریل میرے پاس ایک ایک سورہ کی نقل جس کی لوگوں میں حسب موقع شایع کرنے کی ضرورت ہوا کرتی ہے، لایا کرتے ہیں :"

لیکن بقول سرسید "یہ بیان ایک ایسا بیہودہ بیان ہے جس کی تردید لکھنی بھی بے فائدہ ہے، جب کبھی مسلمانوں کی نظر سے ایسا بیان گذرتا ہے تو وہ حیرت اور تعجب میں پڑ جاتے ہیں کہ یہ کہاں سے اور کیونکر لکھا گیا"۔ "مشہور مورخ مسٹر گبن نے اسی طرح کی جہالت کی باتیں لکھنے میں کچھ تامل نہیں کیا ہے، جو لکھتے ہیں کہ "وجود قرآن بقول آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) یا ان کے تبعین کے غیر مخلوق اور ابدی ذات الٰہی میں موجود ہے، اور نور کے قلم سے لوح محفوظ پہ لکھا ہوا ہے، اس کی ایک نقل کاغذ پہ لکھی ہوئی ریشم اور جواہرات کی جلد میں حضرت جبرئیل فلک اول پہ لے آئے تھے"، لیکن سرسید مرحوم کے خیال میں "لوح محفوظ کا نام مسٹر گبن نے انگریزی ترجمہ میں دیکھ لیا اور اس کی حقیقت کچھ بھی نہیں سمجھی اور یہ بات کہ قرآن مجید مخلوق ہے یا غیر مخلوق، ایک فلسفیانہ مسئلہ ہے جس کے سمجھنے تک مسٹر گبن کا خیال بھی نہیں پہونچا"۔ "ڈین پرڈیڈو کی دلچسپ اور انوکھی باتیں جو بقول سرسید کچھ کم تعجب انگیز اور تحیر آمیز نہیں ہیں، وہ بھی یہاں درج کی جاتی ہیں، ان کا بیان ہے کہ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس کاغذ پہ لکھی ہوئی پوری نقل قرآن مجید کی لائی گئی تھی، اور انھوں نے اس کو ایک صندوق میں رکھا جس کا نام صندوق رسالت تھا، اور ابوبکرؓ نے جو ان کے جانشین ہوئے سب سے اول اس کو جمع کیا، کیونکہ جب مسیلمہ نے ان ہی کی طرح اخیر زمانہ میں نبوت کا

دعویٰ کیا تھا تو ایسی ہی کامیابی کی امید میں، اسی طرح اس نے ایک قرآن مرتب کیا اور اس کی ایک کتاب بنا کر اپنے پیروؤں میں شایع کی، اس وقت ابوبکرؓ نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قرآن کو بھی اسی طرح مشہور کرنا ضروری سمجھا"۔ مگر جیسا کہ سرسید نے تحریر کیا ہے کہ :

> "مذکورۂ بالا یہ چند مثالیں ان سیکڑوں بیہودہ باتوں میں سے ہیں جو عیسائی مصنفوں کی تمام تحریروں میں اسلام کے بارے میں پائی جاتی ہیں، سر ولیم میور نے اپنے استدلالوں میں مسلمانوں کی مذہبی باتوں سے کسی قدر واقفیت ظاہر کی ہے، لیکن اس بات کا افسوس ہے کہ انھوں نے بحث کیلئے صرف ان روایتوں کا انتخاب کیا ہے جن کو خود مسلمان بھی سب سے زیادہ ضعیف، سب سے زیادہ کمزور اور سب سے زیادہ مشکوک اور سب سے زیادہ ناقابل اعتبار خیال کرتے ہیں، یا ان کے مطلب اور مقصد کے بارے میں مختلف الرائے ہیں ..... سر ولیم اپنی کتاب کے حاشیہ میں ارگسی اور وٹیس سے یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ "عبداللہ ابن مسعودؓ نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبانی ایک آیت کو لکھ لیا اور صبح کو اسے کاغذ پر سے اڑا ہوا پایا جس کے بارے میں پیغمبر صاحب نے بیان کیا کہ وہ آسمان پر اڑ گئی، اس کے بعد کی روایتوں میں اس واقعہ میں یہ معجزاتی مضمون اور بڑھا دیا گیا کہ اس آیت کا اڑ جانا بہت سے مسلمانوں کے قرآنوں میں آن واحد میں واقع ہوا تھا"! ہم کہتے ہیں کہ یہ روایت جس کے راوی کا نام بھی معلوم نہیں گویا شیخی کے کبوتر کی طرح بے بنیاد اور صریح ایجاد ہے، اور ہم اس بات سے خوش ہیں کہ سر ولیم میور نے بھی کہا ہے کہ "اس روایت کی کچھ اصلیت نہیں ہے اور وہ بے شبہہ ایک بناوٹ ہے"۔"
>
> (خطبات احمدیہ : ص ۴۶۸-۷۰)

سر ولیم کی "وحی کامل" سر ولیم نے ایک نئی اصطلاح "وحی کامل" کی مسلمانوں کے مذہب میں استعمال کی ہے، اور لکھتے ہیں کہ یہ مسلمانوں کے محاورہ کے مطابق ہے اور پھر اس کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ "وحی کامل سے میری مراد اس وحی سے ہے جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اخیر زمانہ میں موجود اور رواج پائی ہوئی تھی،

جو شاید ضایع یا غارت یا غیر مستعمل ہوگئی ہو، لیکن سرسید فرماتے ہیں کہ :

"اس اصطلاح سے ہم لوگ واقف نہیں ہیں، شاید آیات محکم کا ترجمہ سر ولیم میور نے وحی کامل کیا ہو لیکن آیات محکم کے وہ معنی نہیں ہیں جو سر ولیم میور نے کیے ہیں، لیکن اگر ہم ان کی اس اصطلاح کو تسلیم کرلیں، تو وحی کامل کا لفظ وحی کی اس کامل مقدار پر بولا جائے گا جو جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی، اور ہم اس بات کا یقین دلاتے ہیں اور آگے چل کر ثابت بھی کریں گے کہ کبھی کوئی وحی ضایع یا غارت، یا غیر مستعمل نہیں ہوئی۔" (خطبات احمدیہ، ص ۴۷۰)

قرآنی آیتوں میں ربط اور ترتیب | قرآن مجید کی ترتیب کے بارہ میں سر ولیم میور فرماتے ہیں کہ "قرآن جس طرح ہمارے زمانہ تک چلا آتا ہے، اپنے مختلف حصوں کی ترتیب اور بندش میں مضمون یا وقت کی کسی معقول ترتیب اور نظام کا پابند نہیں ہے، اور یہ قیاس میں نہیں آتا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کو ہمیشہ اسی تسلسل کے ساتھ پڑھنے کے لیے فرمایا ہو، مضامین کی ابتر ملاوٹ، زمانہ اور معنی کے لحاظ سے جابجا بے ربطی، کسی جزو کا جو مدینہ میں نازل ہوا ہو، بعض اوقات اس آیت سے پہلے درج ہونا جو اس سے کافی عرصہ پہلے مکہ میں نازل ہوچکی ہو، کسی حکم کا ایسے حکم کے بعد ہونا جس کی اس پہلے حکم سے تنسیخ یا ترمیم ہوتی ہو یا کسی دلیل کا کسی ایسے درمیانی نقرہ کی وجہ سے منقطع ہوجانا جو اپنے مقصد اور مدعا میں اس سے کوئی مناسبت نہ رکھتا ہو، یہ سب باتیں ہم کو اس امر کے یقین سے باز رکھتی ہیں کہ ترتیب موجودہ یا درحقیقت کوئی اور کامل ترتیب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حیات میں مستعمل اور رائج تھی۔" سرسید مرحوم نے سر ولیم میور کے کلام میں بے ربطی کے باوجود آیات قرآنی کی ترتیب اور ان کے درمیان باہمی ربط پر درج ذیل لفظوں میں اظہار خیال کیا ہے :

"ہم مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ موجودہ قرآن مجید کی ترتیب اسی طرح جیسا کہ قرآن مجید ہے ایسی با قاعدہ ہے اور معنوی اعتبار سے اپنی طرز خاص میں اس قدر مربوط اور مسلسل ہے کہ اس سے زیادہ ہونا ممکن نہیں ہے۔

بہت سی کتابیں آیتوں کے درمیان اس معنوی رشتہ تعلق کی تشریح کی غرض سے تصنیف ہوئی ہیں جو سب سورتوں اور آیتوں کے درمیان موجود ہے، قرآن مجید کی عبارت میں ایسا ایجاز اور اختصار ہے کہ وہ آیتوں کے باہمی تعلق کی جن کے معنی بظاہر ایک دوسرے سے بیگانہ معلوم ہوتے ہیں، کسی قدر تشریح کی ضرورت معلوم ہوتی ہے، اور ان لوگوں کو جو اس سے ناواقف ہیں گو بجنے والی اور سامعہ خراش، ابتر، خام، بے سُری، مکرر بیانی، طول کلامی، الجھانے والی، خام اور مہمل" جیسا کہ سر ولیم میور نے بیان کیا ہے معلوم ہوتی ہیں۔

اس بات کو سمجھنا چاہیے کہ قرآن مجید کسی مصنف کی تصنیف کی ہوئی کتاب نہیں ہے، وہ خدا کا کلام ہے اور بجنسہٖ وہی الفاظ لکھ لیے گئے ہیں، کلام جب مخاطبین سے کیا جاتا ہے تو بہت سے امور مخاطبین کے ذہن میں موجود ہوتے ہیں اور متکلم اپنے کلام سے ان کو محذوف رکھتا ہے، مگر جو شخص کوئی کتاب تصنیف کرتا ہے وہ ایسا نہیں کرتا، عیسائی مصنف اس باریکی پر خیال نہیں کرتے اور نہ آیتوں کی شان نزول ان کے ذہن میں ہوتی ہے، اس لیے ان کو آیات کے ربط میں مشکل پڑتی ہے گو مسلمانوں کو ایسی دشواری نہیں ہوتی۔" (خطبات احمدیہ: ص ۴۷۱)

اس موقع پر سرسید افسوس کے ساتھ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ "سر ولیم میور کے اعتراضات اس قدر عام ہیں کہ جواب کے قابل نہیں، اگر وہ چند مخصوص آیتوں کا نشان دیتے جن میں ان کے نزدیک زمانہ اور معنی کے اعتبار سے جابجا بے ربطی ہو تو اس وقت ہم یقیناً موصوف کی دقتوں کو حل کردیتے اور آیتوں کے درمیان باہمی علاقہ کا نشان دینے کی ذمہ داری اپنے اوپر لیتے۔ (ایضاً ص ۴۷۲)

تدوین قرآن | ترتیب قرآن تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات کے مطابق پہلے سے معلوم اور مشہور تھی، صحابہ کرام میں جو لوگ حافظ قرآن تھے ان کے سینوں میں قرآن مجید اسی ترتیب سے محفوظ تھا جو انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی تھی، پھر صحابہ کرامؓ کے اجماع واتفاق سے

حضرت ابو بکرؓ کے عہد میں ایک نسخہ تیار کر لیا گیا، جس کی مختلف نقلیں حضرت عثمانؓ نے اپنے عہد خلافت میں تمام عالم اسلام میں تقسیم کر وا دیں، سر ولیم میور نے قرآن مجید کی ترتیب، اس کی تدوین اور پھر اس کی نقلوں کی تقسیم کے بارے میں بھی شبہات پیدا کرنے کی کوششیں کی ہیں، انھوں نے مذکورۂ بالا کارروائیوں کو اپنی چابکدستی سے ایسے لفظوں میں بیان کیا ہے جن سے ان کے اغراض و مقاصد بے نقاب ہو جاتے ہیں، سر ولیم میور لکھتے ہیں کہ:

"اصلی جلد جو پہلی دفعہ مرتب ہوئی، حفصہ کے گھر میں دستیاب ہوئی، اور غور و فکر کے بعد اس پر نظر ثانی کی گئی، اگر زید اور اس کے ساتھیوں میں اختلاف پایا گیا تو ساتھیوں کی رائے کو ترجیح دی گئی، اس وجہ سے کہ وہ محاورۂ قریش سے واقف تھے، اور اس نئے مجموعہ کو اس طرح کی زبان سے تطبیق دی جس میں کہ پیغمبر صاحب نے اپنے الہامات کو بیان کیا تھا۔" (سر ولیم میور - خطبات احمدیہ ص ۴۷۳)

سر سید احمد خان نے مذکورۂ بالا اعتراض کا قدرے تفصیل سے جائزہ لیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ سر ولیم میور نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کا ماخذ دریافت کرنے میں ہم نہایت حیرت زدہ ہیں، مسلمانوں کے ہاں تو کسی کتاب میں ایسی حدیث یا کوئی روایت نہیں ہے، سر ولیم میور کے اعتراض میں تین جملے واضح طور پر قابل اعتراض ہیں، "نظر ثانی"، "اس طرح سے تطبیق دی"، اور "نیا مجموعہ"، کسی بھی قسم کی روایت سے ہم کو اس بات کا ثبوت نہیں ملا کہ زید بن ثابتؓ کے جمع کیے ہوئے قرآن مجید میں کبھی نظر ثانی ہوئی ہو، جس حدیث میں اس کا تذکرہ ہے اس کے الفاظ یہ ہیں: فنسخوها في المصاحف" یعنی اس کی چند نقلیں انھوں نے کر لیں مگر اس روایت میں کسی مخصوص نظر ثانی کا تو ذکر ہی نہیں ہے، اس روایت میں یہ عبارت بھی ہے کہ "اذا اختلفتم انتم وزيد بن ثابت في شيئ من القرآن" یعنی جب تم میں اور زید بن ثابت میں قرآن مجید کی کسی چیز میں اختلاف ہو جائے، یہاں لفظ اختلاف سے کئی مفہوم پیدا ہو سکتے تھے، لیکن روایت کے آیندہ لفظوں نے اس کی تعیین کر دی ہے، چنانچہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ "فاكتبوه بلسان قريش" یعنی اس کو قریش کی زبان میں لکھو، اس لیے روایت میں لفظ اختلاف سے

اختلاف تلفظ کے سوا اور کچھ مراد نہ تھی، بخاری کی روایت میں اس مراد کو اور زیادہ واضح کر دیا گیا ہے، اس میں یہ ہے کہ "في عربية من عربية القرآن" یعنی قرآن کے کسی لفظ کی عربی ہیئت میں اختلاف ہو، اور جو تلفظ مد، ادغام اور نون تنوین سے متعلق باتیں ہیں جو عرب کے مختلف قبیلوں میں رائج ہیں، سر ولیم میور کا یہ جملہ کہ "اور اس طرح سے کی زبان سے تطبیق کر دی" یہ غلط فہمی پیدا کرتا ہے کہ جامعین قرآن میں کچھ اختلافات پیدا ہوئے تھے، جن کی وجہ سے انھوں نے پچھلی تحریر میں کچھ تبدیلیاں کر دیں، حالانکہ حدیث سے اس بات کی تائید نہیں ہوتی، جامعین سے اگرچہ یہی کہا گیا تھا کہ اگر تم میں کچھ اختلاف ہو تو قریش کے محاورہ میں لکھو، لیکن اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ ان میں در اصل کوئی اختلاف رونما ہوا تھا، اس لیے سر ولیم میور کا یہ کہنا کہ "انھوں نے کی زبان سے تطبیق کر دی" صحیح نہیں ہے۔

سر ولیم میور کی طرف سے "نیا مجموعہ" کا لفظ بھی محض غلط ہے، جس پر وہ اپنی کتاب کے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ "اس معاملہ کی خرابی اور ناموزونیت سے بچنے کے لیے کہا گیا ہے کہ قرآن مجید اپنے بیرونی لباس کے لحاظ سے عربی کے سات مختلف لہجوں میں نازل ہوا تھا، یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے کہ خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی اس قسم کے خیال کے بانی اور مؤید ہوئے ہوں، تاکہ ایک ہی آیت قرآنی میں لفظوں میں اختلاف کی دقت رفع ہو جائے۔ بقول سر سید:

"یہ (مذکورۂ بالا) عبارت ایک ایسے طرز اور تعصب سے لکھی گئی ہے جس پر ہم افسوس کرتے ہیں، ایسے لوگوں پر جو تقویٰ، نیکی، صداقت، صاف باطنی اور راست بازی کے لیے ممتاز ہوں، دغا فریب اور ریاکاری کا الزام لگانا صحیح دلیل و برہان کے معینہ قوانین اور اخلاق و تہذیب کے تسلیم شدہ اصول کے خلاف ہے، ہم اس بات کو اس کتاب کے پڑھنے والوں کی رائے پر چھوڑتے ہیں، اور اس سے زیادہ بحث نہیں کرتے، کیونکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ وہ لوگ جو سچے پاکباز اور تقویٰ شعار ہیں وہ کسی مذہب اور ملت کے کیوں نہ ہوں مگر وہ ویسی ہی تعظیم اور تکریم کے مستحق ہیں جیسے کہ خود اپنے یہاں کے بزرگ

اور مقدس لوگ، پھر کیا سر ولیم میور اس بات سے بھی ناواقف ہیں کہ عربی زبان میں الفاظ کو مد یا بغیر مد کے، ادغام یا بغیر ادغام کے اور تنوین نون کے ساتھ یا بغیر نون کے پڑھنے سے جو عرب کے مختلف قبیلوں میں مختلف طریقے سے رائج تھے تلفظ میں کس قدر فرق ہو جاتا ہے، لیکن لفظ یا معنی میں کچھ فرق نہیں ہوتا، یا کوئی لفظ اپنے اصلی مادہ میں تبدیلی کے بغیر مختلف صورتوں سے پڑھا جا سکتا ہے، جیسے کہ سورۂ فاتحہ میں مَالِكِ کا لفظ ہے، جو قدیم طرز تحریر میں ملك لکھا جاتا تھا، اور اسے مَلِكِ، مَلاكِ، مَالِكِ بھی پڑھا جا سکتا ہے، چنانچہ عرب میں مختلف قبیلوں میں اس لفظ کے تلفظ میں فرق تھا، اور اس کے باوجود اس لفظ کے مادہ یا معنی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا لیکن قریش کی زبان میں مَالِكِ کا تلفظ جاری تھا، اس کا قرآن مجید میں قائم رکھنا کیونکر اعتراض کا مستحق ہو گیا۔

سر ولیم میور نے جو کچھ لکھا ہے اس میں در اصل ان اغراض و مقاصد کی تکمیل کرنی تھی جن کیلئے انھوں نے یہ کتاب لکھی ہے مگر سب سے زیادہ سچی بات جو ان کے قلم سے نکلی ہے وہ یہ ہے کہ "دنیا میں غالباً کوئی اور ایسی کتاب نہیں ہے جو بارہ سو برس تک ایسے خالص متن کے ساتھ رہی ہو، اور ہم مسلمانوں کا تو یہ عقیدہ ہے کہ وہ ہمیشہ ایسی ہی رہے گی، اس بات کی تصدیق اس پیشین گوئی سے ہوتی ہے جو قرآن مجید میں موجود ہے، خدا فرماتا ہے: "إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ" (ہم نے قرآن مجید کو اتارا ہے، اور ہم یقیناً اس کی حفاظت کریں گے)" (خطبات احمدیہ ص ۶، ۴)

سر ولیم میور نے عہد عثمانی میں قرآن مجید کی نقلیں کیے جانے کے واقعہ کی یہ عجیب توجیہ کی ہے کہ "اگر ابوبکرؓ کے قرآن کا متن خالص ہوتا تو اس قدر جلد وہ کیونکر خراب ہو جاتا کہ اپنے اختلافات کی وجہ سے ایک کامل نظر ثانی کا محتاج ہو گیا"۔ لیکن سر سید کہتے ہیں کہ:

"ہم نہایت صاف طور پر یہ ثابت کر چکے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کا قرآن نہ خراب ہوا تھا اور نہ اس میں

کسی نظر ثانی کی ضرورت پڑی، اور نہ ہی اس میں نظر ثانی کی گئی تھی، بلکہ صرف اس کی نقلیں کی گئی تھیں"

(خطبات احمدیہ ص ۶، ۴)

تبدیلی آیات

سر ولیم میور لکھتے ہیں کہ "اس دعوے کے واسطے کہ خود پیغمبر صاحبؐ ہی نے بعض آیات کو جو ایک مرتبہ وحی ظاہر کی گئی ہوں، بعد کو تبدیل یا خارج نہ کر دیا ہو کوئی دلیل نہیں ہے"۔ وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں دو مثالیں بھی پیش کرتے ہیں، جو واقدی کی بیان کردہ ہیں، خود سر ولیم میور کے بیان کے مطابق "ایک روایت تو یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے ابی ابن کعبؓ کی تعریف کی اور فرمایا کہ وہ قرآن مجید کا سب سے کامل قاری ہے، ابی کی قرارت میں شامل بعض آیتوں کو ہم چھوڑ دیا کرتے ہیں کیونکہ ابی کہتے ہیں کہ میں نے پیغمبر صاحبؐ کو یوں فرماتے سنا ہے، اور میں ایک لفظ بھی جو پیغمبر صاحبؐ نے قرآن مجید میں درج کیا ہے نہیں چھوڑتا ہوں مگر اصل یہ ہے کہ قرآن مجید کے وہ حصے ابی کی عدم موجودگی میں نازل ہوئے تھے، جو بعض آیتوں کو جن کو وہ پڑھتا ہے تنسیخ یا ترمیم کرتے ہیں"۔ سر سید نے اس روایت پر مندرجہ ذیل تبصرہ کیا ہے:

"جو کچھ سر ولیم میور نے بیان کیا ہے اس اصل حدیث کے مضمون سے جو حضرت عمرؓ سے منقول ہے سراسر خلاف ہے، اور اس عبارت کا کہ "بعض آیات کو جو ابی کے پڑھنے میں شامل ہیں چھوڑ دیا کرتے ہیں" اس حدیث میں پتہ بھی نہیں ہے اصل حدیث (بخاری کتاب التفسیر عن ابن عباس) یہ ہے (ترجمہ) حضرت عمرؓ نے کہا ہم لوگوں میں ابی بڑے قاری ہیں اور علیؓ بڑے قاضی ہیں، اور ہم لوگ ابی کا قول چھوڑ دیتے ہیں بات یہ ہے کہ ابی کہتے ہیں کہ میں کوئی چیز جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن چکا ہوں نہ چھوڑوں گا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے: "مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسِهَا"۔

اس حدیث سے ظاہر ہے کہ کسی جگہ اس میں یہ ذکر نہیں ہے کہ حضرت عمرؓ بعض آیات قرآنی کو جن کو ابی پڑھا کرتے تھے چھوڑ دیا کرتے تھے، یہ حدیث قرآن مجید سے احکامات مستنبط کرنے سے متعلق ہے، ابی قرآن مجید کی ہر آیت سے

حکم کا استخراج کرتے تھے، اور جملہ احکام کو صحیح خیال کرتے تھے، ان کی رائے میں ظاہر آیات سے جو معنی یا احکام نکلتے ہوں، ان کے استخراج میں دوسری آیت پر نظر رکھنا ضروری نہیں جیسا کہ اہل ظواہر کا مسلک ہے، لیکن حضرت علی مرتضیٰ کی رائے اس کے برعکس معلوم ہوتی ہے، اس پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ اُبی سب سے اچھا قرآن پڑھنے والے ہیں، اور حضرت علیؓ ہم میں سب سے بڑے قاضی یعنی سب سے بہتر حکم دینے والے ہیں اور ہم سب سے زیادہ قرآن مجید سے احکام و قوانین مستنبط کر سکتے ہیں، اس لیے ہم اُبی کے قول کو یعنی جو حکم انھوں نے قرآن سے نکالا ہے چھوڑ دیتے ہیں اور حضرت علیؓ سے اتفاق کرتے ہیں، ہماری اس تشریح کی تصدیق، دوسری باتوں کے علاوہ اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ بخاریؒ نے جو مسلمانوں میں نہایت نامور مقدس اور مستند محدثین میں سے ہیں اس حدیث کو اس مقام پر بیان کیا ہے جہاں کہ احکام ناسخ و منسوخ سے بحث کی گئی ہے، نہ کہ اس جگہ جہاں کہ انھوں نے مختلف قراءتوں کو بیان کیا ہے، بخاریؒ نے اسی حدیث کو کسی قدر ترمیم شدہ صورت میں قاریوں کے باہمی اختلاف کی بحث (باب القراء) میں بھی بیان کیا ہے، اور اس میں قراءت کے بجائے "لحن" کا لفظ ہے، جس کے معنی یہ ہوئے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کے لحن کو (یعنی قراءت کے طریقہ کو) اُبی کے لحن پر ترجیح دی بہرحال سر ولیم میور نے یہ معنی جو نکالے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے کہا کہ ہم بعض آیتوں کو جو اُبی کے پڑھنے میں شامل ہیں چھوڑ دیا کرتے ہیں" یہ محض زبردستی کی ایک بات ہے، (روایت کے الفاظ میں اس معنی کی کوئی گنجائش نہیں)

(خطبات احمدیہ : ص ۴۸۰-۴۷۷)

(باقی)

حضرۃ العلامہ سید سلیمان ندوی رح کا مسلکِ طریقت

(از ، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی صدر شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی، دہلی)

نہ من تنہا دریں میخانہ مستم　　جنید و شبلی و عطار شد مست

قرآن کریم میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے ابتلاء و آزمائش میں ڈالے جانے اور قبولِ توبہ کے بعد اُن پر عنایاتِ الٰہی کا ذکر اِن الفاظ میں کیا گیا ہے:

وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰى	ہم نے سلیمانؑ کو آزمایش میں ڈالا، اور ان کے
كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ قَالَ	تخت پر ایک بڑا دھڑ ڈال دیا، پھر
رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا	انھوں نے توبہ کی اور التجا کی: یارب مجھے
لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ۚ اِنَّكَ	معاف کردے اور ایسا ملک عطا کر جو میرے بعد
اَنْتَ الْوَهَّابُ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ	کسی اور کو نصیب نہ ہو، تو یقیناً بڑا بخشش
تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَاۗءً حَيْثُ اَصَابَ	کرنے والا ہے، تو ہم نے اس کے لیے ہوا کو
وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّاۗءٍ وَّغَوَّاصٍ ،	مسخر کردیا کہ وہ اس کے اشاروں پر چلنے لگی،
وَّاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ،	اور سارے شیطان جن میں معمار، غوطہ خور اور کچھ
هٰذَا عَطَاۗؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ	دوسرے زنجیروں میں بندھے ہوئے تھے سب
بِغَيْرِ حِسَابٍ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى	اسی کے لیے مسخر کر دیئے تو یہ ہے ہماری عطا، اس پر

وَحُسۡنَ مَاٰبٍ ۔

تم شکر گذاری کرو، یا اسے بغیر حساب اپنے
پاس رکھو، اور اس کے لیے ہمارے پاس
حسن خاتمہ اور قربتوں کی نعمت بھی ہے۔

(۳۸ ص ۳۴ - ۴۰)

ان آیات کو سرنامہ بنانے سے مقصود یہ ہے کہ اگر توبہ و انابت کرنے والا ایک اولوالعزم پیغمبر ہو اور بے حساب بخشش کرنے والا ایک کریم مطلق تو اسے نہ ہم اپنی بودی توبہ پر قیاس کر سکتے ہیں، نہ عطایائے ربانی کو اپنی محدود اور ناقص فہم کے پیمانوں سے ناپ سکتے ہیں، یہ بے حساب بذل و عطا اتنی عام اور بیکراں ہو جاتی ہے کہ کبھی صرف ہم اسمی کی نسبت سے بھی ان فیوض و برکات کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، چنانچہ دیکھ لیجیے کہ شمالی ہند کی مسلم سوسائٹی نے ماضی قریب میں کئی سلیمان پیدا کیے، جن کے قومی، مذہبی یا علمی کاموں کو دیکھ کر یقین ہوتا ہے کہ ان پر بھی دعائے پیغمبری هَبۡ لِیۡ مُلۡکًا لَّا یَنۡۢبَغِیۡ لِاَحَدٍ مِّنۡۢ بَعۡدِیۡ کا سایہ پڑا تھا، اور یہ بھی امید ہے کہ ان کے حق میں وعدۂ صادقۂ الٰہی اِنَّ لَهٗ عِنۡدَنَا لَزُلۡفٰی وَحُسۡنَ مَاٰبٍ بھی ضرور پورا ہوگا۔

پنجاب میں شاہ محمد سلیمان تونسوی چشتی نظامی (۱۷۷۰ء۔ ۱۸۵۰ء) نے شمع روحانیت کو روشن کیا، اور نہایت نامساعد حالات میں تونسہ جیسے غیر معروف قصبہ کو اشاعت دین اور اصلاح و تربیت کا مرکز بنا دیا تو بہار میں شاہ محمد سلیمان پھلواروی نے اشاعت علوم اور تربیت و ارشاد کے شاندار کارنامے انجام دیے، میرے استاد و پیر و مرشد حضرت شاہ سلیمان احمد چشتی امروہوی (م یکم جنوری ۱۹۶۲ء) سجادہ نشین حضرت شاہ عبدالہادی چشتی و حضرت شاہ عبدالباری چشتی رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی ایسے باکمال بزرگ تھے کہ اب ان کے ظاہری و باطنی اوصاف کو یاد کر کے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب یہ آنکھیں کسی ایسے کو نہ دیکھیں گی۔

حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی کی انگوٹھی کے عقیق پر بھی یہی دعائے سلیمانی کندہ تھی :
رَبِّ اغۡفِرۡ لِیۡ وَهَبۡ لِیۡ مُلۡکًا لَّا یَنۡۢبَغِیۡ لِاَحَدٍ مِّنۡۢ بَعۡدِیۡ اور ظاہر ہے کہ سلطان المشائخ کے بوریائے فقر

پر بھی کوئی ایسی شان والا پھر نہ بیٹھ سکا۔

حضرۃ العلامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ علم و دانائی کے ہفت اقلیم کے تاجدار تھے، تفسیر، حدیث، فقہ، سیرۃ، منطق و کلام، تاریخ اور تصوف ہر قلمرو میں ان کا سکہ چلتا تھا، سلیمان پیغمبر کی طرح اللہ نے ان کے لیے بھی شہرت و ناموری کی ہواؤں کو مسخر کر دیا تھا اور خواہ وہ معاند مستشرقین ہوں، یا خامکار محققین سب ان کی پیشی میں مُقَرَّنِیۡنَ فِی الۡاَصۡفَادِ نظر آتے ہیں۔

ہر ظاہر کا ایک باطن ہے تو علم بھی الفاظ کے وسیلہ سے جہان معنی تک پہونچنے کا نام ہے، ظاہر علم کا رشتہ گہرائیوں سے گذر کر باطن علم سے جڑتا ہے، یہاں سطح ظاہر سے اوپر اٹھنا نہیں ہے، سطح کے نیچے اور لفظوں کی تہ میں معانی حاصل کرنا ہے، یہ توفیق ہر ایک کو نہیں ملتی اور جنھیں یہ سعادت ملتی ہے وہ ظاہر علم کی ماہیت اسی طرح بدل دیتے ہیں جیسے خدا کی ایک ننھی سی مخلوق شہد کی مکھی پھولوں اور پھلوں کو شہد میں تبدیل کر دیتی ہے، جسے قرآن نے شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ کہا ہے علم ظاہر بھی ایک مرحلہ میں معرفت کا شہد بن جاتا ہے، جس میں ہماری روحانی شفا ہے۔

کہتے ہیں کہ علم کی ابتدا حیرت ہے اور فلاسفہ کیلیے اس کا انجام بھی حیرت کے سوا کچھ نہیں ہے، لیکن جو علماء جویائے حق ہیں اور کہتے ہیں : رَبَّنَا اَرِنَا حَقِیۡقَةَ الۡاَشۡیَآءِ کَمَا هِیَ ان کا علم منزل معرفت و حقیقت کا راستہ بن جاتا ہے، حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کو اللہ نے وہ علم نہیں دیا تھا جو شہرت یا رزق کمانے کے کام آتا ہے، اس علم سے نوازا تھا جو معارف کا زینہ ہے اور جو لاانتہا کی سیر بے نہایت تک پہونچا دیتا ہے، اس منزل پر عالم خود ایک روشنی بن جاتا ہے جو دوسروں کی راہیں اجالتی ہے، مشہور مقولہ ہے موت العالِم موت العالَم، لیکن عموماً اس کا مفہوم غلط سمجھا گیا ہے، ایک فرد کی موت ساری دنیا کی موت کیسے ہو سکتی ہے؟ یہاں عالَم دنیا کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ علم کا اسم آلہ ہے بر وزن فاعَل، مراد یہ کہ عالِم کی موت صرف ایک صاحب علم کی موت ہی نہیں، ایک وسیلہ علم کا فقدان بھی ہے، یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا، میں اس علم کی بات

کر رہا تھا جو لفظوں سے پرے اور کتابوں سے ماورا ہو کر ملتا ہے، اسی کو عارف رومی نے یوں کہا ہے:

صد کتاب و صد ورق در نار کن — سینہ را از نور حق گلزار کن

ان راہوں سے اس منزل تک ایسی سبک روی اور سرخ روئی کے ساتھ پہونچنے کی مثالیں بہت ہی کم ہیں، چھٹی صدی ہجری میں امام محمد غزالیؒ ہیں، جنھوں نے علم کی پستی سے اوپر اٹھ کر اور دین کی ماہیت میں نیچے اتر کر معرفت کی منزل اعلیٰ تک جانے کا اپنا سفرنامہ المنقذ عن الضلال میں لکھا ہے، ساری عمر درس و تدریس اور شغل کتاب و تصنیف میں منہمک رہنے والے کا ضمیر جب اچانک جاگ اٹھتا ہے اور علم و فضل کا سارا طمطراق ہکا بکا ہو کر سنتا ہے کہ یہ کیا آواز آرہی ہے:

فصارت شهوات الدنيا تجاذبني	خواہشات دنیا نے مجھے اپنی زنجیروں میں
بسلاسلها الى المقام ومنادى	باندھ کر کھینچنا شروع کیا کہ میں قیام کر دوں،
الايمان ينادي: الرحيل الرحيل	اور ایمان کی ندا دینے والا کوچ کی صدا لگا
فلم يبق من العمر الا قليل و	رہا تھا عمر تھوڑی رہ گئی ہے اور تیرے سامنے
بين يديك السفر الطويل و	طویل سفر ہے اور جن چیزوں میں تو پھنسا
جميع ما انت فيه من العمل	ہوا ہے علم اور عمل یہ سب ریا و تخییل ہیں، اگر
والعلم رياءٌ وتخييل، فان	آج آخرت کے لیے تیاری نہیں کرے گا تو پھر
لم تستعد الآن للآخرة فمتى	کب کرے گا؟ اور آج ان بندھنوں سے
تستعد وان لم تقطع الآن هذه	دامن نہیں چھڑائے گا تو پھر کب چھڑائے گا۔
العلائق فمتى تقطع؟	

. . .

آخر تلاش تحقیق اور علم و تدقیق کا یہ اضطراب ایک ایسی سکینہ و طمانینت کے عالم تک لے گیا جس کی

تمنا تو بہتوں نے کی ہے مگر اسے کم ہی خوش نصیبوں نے پایا ہے:

اے خدا بنما تو جاں را آں مقام — کاندراں بے حرف می روید کلام

اس مقام سکینت کے طلبگار تو ہمیں ہزاروں نظر آجاتے ہیں مگر ان حدود تک پہونچ جانے والوں کی پرچھائیں کا بھی ہم ادراک نہیں کر سکتے، بس عارف رومی ہی اس کا کچھ بیان کر سکتا ہے:

من ز تن عریاں شدم او از خیال — می خرامم در نہایات الوصال

ہماری صفوں میں عالموں، محققوں، دانشوروں اور مفکروں کی کمی نہیں ہے، علم کا ایک حصہ وہبی ہے، اور خدا کی بخشش بے حساب ولازوال ہے وہ آج بھی ہے اور کل بھی رہے گی، دوسرا حصہ کسبی و اختیاری ہے، اس میں بھی انسان کی جد و جہد کا عمل بقدر توفیق جاری رہتا ہے، لیکن وہ علم جو سبب معرفت بنتا ہے اور جو خود ایک منزل پر ہیچ و پوچ معلوم ہونے لگتا ہے وہ اخص خواص ہی کو ملتا ہے، صوفیا علم کو بھی حجاب ہی کہتے ہیں، العلم حجابُ اکبر، ان کا قول ہے کہ معاصی حجابات ظلمانی ہیں اور علم حجاب نورانی ہے، روشنی کے وفور میں بھی انسان حقیقت اشیاء کو نہیں پہچان سکتا، تصوف کی راہ میں سب سے افضل مرتبہ سالک مجذوب کا ہے جسے دوسرے لفظوں میں "فقیہ صوفی" بھی کہا جا سکتا ہے، یہ وہ منزل ہے جہاں خورشید حقیقت طلوع ہوتا ہے تو علم کے شبنمی قطرات دیر تک تاب مقاومت نہیں لا سکتے، اور آخر علم مغلوب ہو جاتا ہے۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ جب حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ سے بیعت ہوئے تو انھوں نے شیخ سے عرض کیا کہ میں ایک طالب علم ہوں، ابھی سلسلۂ تعلیم جاری ہے، اسے یوں ہی جاری رکھوں یا چھوڑ کر اوراد و وظائف میں لگ جاؤں؟ شیخ نے فرمایا: "میرا یہ طریقہ نہیں کہ کسی کو تحصیل علم سے باز رکھوں، تم دونوں شغل جاری رکھو اور پھر دیکھو کہ کون سا غالب رہتا ہے"! حضرت نظام الدینؒ نے ایک زمانہ کے بعد اپنی مجلس میں فرمایا کہ میں نے نہ کسی کو غالب دیکھا نہ مغلوب پایا، کہنے کو یہ ایک سادہ سا

چھوٹا سا جملہ ہے، مگر ایک انتہائی دشوار مقام کی طرف اشارہ کر رہا ہے جہاں ظاہر و باطن میں ایک توازن پیدا ہو جاتا ہے اور وہ استقامت ملتی ہے جسے "فوق الکرامۃ" کہا گیا ہے، یہی توازن ہمیں مولانا سید سلیمان ندویؒ کی شخصیت میں نظر آتا ہے، وہ ایسے "فقیہ صوفی" ہیں جنھوں نے علم ظاہر و باطن میں توازن پیدا کیا اور اسے مستقیم بھی رکھا۔

سید صاحبؒ کا یہ سفر حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے آستانہ پر تمام ہوتا ہے:

آں دل کہ رم نمودے از خوبرو جواناں
دیرینہ سال پیرے بُردش بیک نگاہے

(وہ دل جو خوبصورت جوانوں سے بھی بھاگتا تھا اسے ایک بوڑھے نے ایک نگاہ میں چھین لیا)۔

تھانہ بھون جیسے چھوٹے سے قصبہ میں پہونچ کر وہ پکار اٹھتے ہیں:

من کہ در ہیچ دیارے نزدم خیمۂ عشق
پیش تو رخت بیفگندم و سر بنہادم

(میں نے کسی شہر میں خیمۂ عشق نہیں لگایا تھا، مگر تیرے سامنے آیا تو اپنا رخت سفر ڈال دیا، اور سر جھکا دیا)

وہ مرید جو قرآن کی حکمتوں کا جاننے والا، اسرار حدیث کا شناسا، اور اسلامی فکر کے قاموس کا شناور تھا اس نے اپنے مرشد روحانی کا انتخاب کرنے میں کیسی کچھ چھان بین نہ کی ہوگی، خود کہتے ہیں کہ:

"کامل دس برس تک پیچھے ہی پیچھے ہندوستان سے عرب تک نظر دوڑاتا رہا، لیکن کوئی ہستی ایسی نظر نہ آتی تھی جو میرے درد کی درمانی کر سکے، بعض بزرگ ملے بھی تو طبیعت کو ان سے مناسبت نہیں ہوئی، بار بار یہی خیال آتا تھا کہ کاش حاجی امداد اللہ صاحب حیات ہوتے۔"

حضرت حاجی امداد اللہ فاروقی مہاجر مکی علیہ الرحمۃ (م ۱۳ر جمادی الثانیہ ۱۳۱۷ھ، مطابق ۱۹ر اکتوبر ۱۸۹۹ء) اپنے زمانہ میں آیۃ من آیات اللہ تھے، آج ہر طرف اُن ہی کا

روحانی فیضان ہے جس نے دین و دانش کی محفلوں کو اجال رکھا ہے، وہ دارالعلوم دیوبند ہو یا مظاہر العلوم سہارن پور، ندوۃ العلماء ہو یا مدرسہ صولتیہ (مکہ معظمہ) جامعۂ نظامیہ (حیدرآباد) ہو یا جامعہ اشرفیہ لاہور، سب کی نسبت ان کی ذات سے جڑی ہوئی ہے، سرسید احمد خان پر بھی ان کی چشم عنایت تھی اور انھوں نے فرمائش کر کے سرسید سے ایک رسالہ کا ترجمہ بھی کرایا تھا، پچھلی صدی میں کوئی ممتاز عالم دین، کوئی درویش، کوئی خانقاہ ایسی نہیں ہے جس تک بالواسطہ یا بلاواسطہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کا فیضان عمیم نہ پہونچا ہو۔

یک خرقۂ غمت دریت نگذاشت
در صومعۂ کبود پوشان

(تیرے غم نے خانقاہوں میں ایک خرقہ بھی سالم نہیں چھوڑا ہے)

وہ سلسلۂ نقشبندیہ میں حضرت شاہ نصیر الدین نقشبندیؒ سے بیعت ہوئے، پھر چشتی سلوک کی تکمیل میاں جی نور محمد جھنجھانوی (م ۴ر رمضان ۱۲۵۹ھ) سے کی، میاں جی کو نعمت باطنی حضرت سید عبدالرحیم فاطمی شہید بالاکوٹ (۲۴ر ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۶ر مئی ۱۸۳۱ء) سے ملی تھی، جنھیں خلافت و اجازت قیوم زمانی حضرت شاہ عبدالباری چشتی امروہوی (م ۱۱ر شعبان ۱۲۲۶ھ مطابق ۳۱ر اگست ۱۸۱۱ء) سے حاصل تھی، حضرت عبدالرحیم فاطمی امروہہ سے مجاہدین کا ایک مختصر دستہ لیکر حضرت سید احمد شہیدؒ رائے بریلوی کے ساتھ جہاد میں شامل ہوئے تھے، اور ان کے ساتھ ہی شہید ہوئے۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

(انھوں نے خاک و خون میں لوٹنے کی کیا ہی اچھی رسم ایجاد کی ہے، خدا ان عاشقانِ پاک طینت پہ رحمت کرے)

وہ مجاہدۂ فنا کی دشوار گذار منزلوں سے یوں چشم زدن میں گذر گئے کہ آج بس آوازہ نیکنامی

رہ گیا ہے، نشانِ قبر تک باقی نہیں۔

بعد از وفات تربت ما در زمیں مجوے — در سینہ ہائے مردم عارف مزارِ ما

(ہماری موت کے بعد ہماری تربت زمین پر تلاش نہ کرنا، کیونکہ ہمارا مزار عارفوں کے سینوں میں ملے گا۔)

مولانا سید سلیمان ندویؒ کا دل اگر حاجی صاحب کی طرف کھنچتا تھا تو یہ خود اخلاص اور طلب صادق کی دلیل ہے، اشتیاق کی آگ برسوں سے سلگ رہی تھی، ۱۹۲۹ء میں انھوں نے حضرت حاجی صاحبؒ کو خواب میں دیکھا تو سید صاحبؒ نے اپنے اور پھر حاجی صاحبؒ کے سینے کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے عرض کیا کہ "اس کو ایسا کر دیجئے"۔ حاجی صاحبؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ "اب تم میں ایسا نہیں کر سکتا"، اشارہ واضح تھا کہ شیخ کا عالم ظاہر میں ہونا ضروری ہے اور اب وہی ان مقامات کی سیر کرا سکتا ہے جسے باطنی نعمت کے ساتھ اجازت حاصل ہو، تھانہ بھون میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ خانقاہ امدادیہ میں رونق افروز تھے، وہ ظاہر و باطن کی خوبیوں کے علاوہ ایک ممتاز عالم دین، فقیہ، مفسر، متکلم، مصلح و مجدد بھی تھے اور امراض نفسانی و خباثتِ روحانی پر گہری نظر رکھتے تھے، جس طرح ایک طبیب امراض جسمانی کی تشخیص اور ان کا بتدریج علاج کرتا ہے، اسی طرح مولانا تھانویؒ کا روحانی مطب چلتا تھا، ان کے مواعظ اور ملفوظات بھی اتنی کثرت سے اور ایسے اہتمام سے جمع ہوئے ہیں کہ اور کسی کے مواعظ و ملفوظات کی گرد آوری کا وہ اہتمام کبھی نہیں ہوا، مگر مولانا تھانوی ایسے جغرافیائی علاقہ میں، ایسے تاریخی سیاق میں اور ایک ایسی زوال آمادہ سوسائٹی میں پیدا ہوئے کہ انھیں پہچاننے کا حق ادا نہ ہو سکا، جسے دقائق شریعت سے، فکر اسلامی سے، نظام عبادات اور تصوف اسلامی کے عملی و نظری مسائل سے دلچسپی ہو اور انھیں سمجھنے کے علاوہ استقامت فکر کا طلبگار ہو، اس کے لیے یہ مواعظ و ملفوظات نہایت

گرانقدر سرمایہ ہیں، میں ان کے مسلک سے لازماً ہر جگہ اتفاق نہ کرنے پر بھی مولانا تھانویؒ کا احترام کرتا ہوں۔

مولانا تھانویؒ حضرت حاجی صاحبؒ سے ان کے آخری زمانۂ حیات میں مستفید ہوئے تھے اور یہ فرماتے تھے کہ "ہم نے حاجی صاحبؒ کے کچے پھل کھائے ہیں"، اور خود مولانا تھانویؒ کے شجر معرفت پر پکے ہوئے پھل مولانا سید سلیمان ندویؒ کو نصیب ہوئے، مقامات سلوک تو سید صاحبؒ طے کر کے ہی وہاں پہونچے تھے، کسی ریاضت یا مجاہدہ کی ضرورت تو انھیں ہوتی ہے جو خامی میں پختہ ہو جاتے ہیں، سید صاحبؒ کو تو پاک باطن درویشوں کے اس سلسلۃ الذہب میں شامل ہونا تھا اور اس نسبت کا حصول ہی کرنا تھا، کہتے ہیں کہ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی صرف ۱۷ دن شیخ شہاب الدین سہروردی کی خانقاہ میں رہے، اور خلافت سے مشرف ہو کر رخصت کر دیے گئے، بعض درویش برسوں سے مجاہدات کر رہے تھے، انھوں نے شیخ سہروردی سے دبے لفظوں میں شکایت کی ہوگی کہ یہ امتیازی سلوک کیوں؟ تو انھوں نے فرمایا کہ "زکریا سوکھی لکڑیاں لایا تھا میں نے آگ دکھا دی، تم ابھی گیلی لکڑیاں لیے بیٹھے ہو"۔ سید صاحبؒ تو شاید آگ بھی خود ہی لگا چکے تھے، بس کسی کے دامن کی تھوڑی سی ہوا درکار تھی، اور یہ مقصد خانقاہ امدادیہ میں حاصل ہو گیا،

خام بدم پختہ شدم و سوختم۔

حضرت تھانویؒ کو بھی اپنے مسترشد سے ایسا قلبی لگاؤ تھا کہ کبھی جوشِ محبت میں استقبال کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں، کبھی فرماتے ہیں کہ آدھی رات کو آنکھ کھل جاتی ہے تو بے اختیار جی چاہتا ہے کہ مولوی سید سلیمان کو بلا لوں اور ان سے باتیں کر لوں، کبھی اپنا عصائے خاص یہ کہہ کر مرحمت فرماتے ہیں کہ "راحت جان، راحت جسم کا سامان بھیج رہا ہوں"۔ اور سید صاحبؒ جواباً عرض کرتے ہیں کہ اس عطائے خاص سے میں نے استقامۃ فی العمل کی تعبیر لی۔ تو شیخ سیکڑوں دعاؤں سے

سرفراز کرتے ہیں، کبھی سید صاحب کی مدح میں اشعار موزون کرنے لگتے ہیں :

اے دلت معمور از اسرارِ حق — اے دلت مغمور از آثارِ حق

اے دلت پر نور از انوارِ حق — اے دلت مسرور از اخبارِ حق

اور خلافت دے کر شیخ نے حاضرین سے فرمایا کہ "الحمدللہ اب مجھے کچھ فکر نہیں، میرے بعد ایسے ایسے لوگ موجود ہیں"، ظاہر بینوں کے ایک حلقہ نے اس وقت بھی چہ میگوئیاں کی تھیں کہ سید صاحب رح نے علم و تحقیق کا میدان چھوڑ دیا اور ذکر جہر کرنے لگے ہیں، اب بھی کچھ لوگوں کو یہ کہتے سنا جاتا ہے کہ وہ دنیائے علم کو بہت کچھ دے سکتے تھے، مگر خود کو معطل کر کے بیٹھ گئے، میں کہتا ہوں کہ سید صاحب رح خوش نصیب تھے کہ انھوں نے علم کی شمعیں جلا کر دوسروں کو بھی راہ دکھائی اور خود بھی منزل عرفان تک پہونچ گئے، جو ان سے مزید علمی کاوشوں کا مطالبہ کرتے ہیں وہ پہلے تو کوئی ایسی دوسری شخصیت بتائیں جس نے اتنا اور ایسا عظیم الشان کام کیا ہو، پھر یہ بتائیں کہ سید صاحب رح نے جو کچھ علمی سرمایہ چھوڑا ہے کیا انھوں نے واقعی اس کی اہمیت اور قدر و قیمت کو پہچان لیا ہے ؟

ایسے ہی ایک علمی مذاق رکھنے والے بزرگ حضرت بابا فرید گنج شکر سے بیعت ہو گئے تھے، اور اپنے مدرسہ کے ساتھیوں سے طعنے سنتے تھے، بابا صاحب نے ان سے کہا تھا کہ اب تمھیں کوئی طعنہ دے تو کہہ دینا :

نہ ہمراہی تو مرا راہ خویش گیر و برو — ترا سعادتے بادا مرا نگوں ساری

صوفیاء کے ہاں خلافت کی بھی کئی قسمیں ہیں، ان میں سب سے افضل خلافت رحمانی ہے جو اشارۂ غیبی سے کسی کو دی جاتی ہے، حضرت نظام الدین اولیاء رح کو یہی خلافت ملی تھی اور پہلی بار انھیں دیکھ کر بابا فرید نے یہ شعر پڑھا تھا :

اے آتشِ فراقت دلہا کباب کردہ — سیلاب اشتیاقت جانہا خراب کردہ

اور یہ عجیب امتیاز ہے کہ سلسلۂ چشتیہ صابریہ امدادیہ کے اکثر بزرگوں کو یہی خلافت رحمانی باشارۂ غیبی عطا ہوئی، سید عبدالرحیم فاطمی ایک خواب دیکھ کر افغانستان سے چلے اور بیسیوں خانقاہوں کو دیکھتے بھالتے امروہہ پہونچ گئے، جہاں انھیں حضرت شاہ عبدالباری سے نعمت باطنی حاصل ہو گئی، حضرت حاجی امداد اللہ رح نے بھی خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا ہاتھ میاں جیو نور محمد جھنجھانوی کے ہاتھ میں دے دیا ہے، ایسی اور بھی مثالیں ہیں، سید صاحب رح کو بھی یہی خلافت رحمانی عطا ہوئی تھی، ایک بار انھوں نے لکھا : "مجھے فخر یہ ہے کہ لوگوں نے مولانا تھانوی رح کو اپنی طرف کھینچا، اور مجھے خود مولانا تھانوی رح نے بار بار اپنی طرف کھینچا (بعالم رویا) یہ اسی خلافتِ رحمانی کی کششِ تھی۔

حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رح کی نسبت تمام تر نسبت عشقی ہے، ان کا باطن چشتی انوار سے معمور ہے، لیکن وفور علم نے اس کو حب عقلی بنا دیا ہے جو زیادہ پائدار ہوتی ہے، چشتیہ کے یہاں سلوک کا کوئی نصاب مقرر نہیں اور لطائف کی چھان بین بھی نہیں ہے، ان حضرات کا سب سے اہم لطیفہ "قلب ہے" اور یہی عین قرآنی سلوک ہے : مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ ۔

سید صاحب رح نے فرمایا کہ حضرت تھانوی رح کا سلسلہ نقشبندی و چشتی کا سنگم ہے، ذوق و شوق چشتی ہے اور اتباع کا ذوق نقشبندی، حضرت حاجی صاحب دونوں سلسلوں کا قران تھے، اگرچہ غلبہ چشتی نسبت ہی کو تھا، سید صاحب میں بھی اس جامعیت کے آثار پوری طرح ظاہر ہیں۔

علمی حلقوں سے ایک اعتراض یہ بھی اٹھا کہ بیعت کے بعد سید صاحب نے اپنی تمام تصانیف پر نظر ثانی کی، اور بعض اعتقادی باتوں سے رجوع کر لیا، اس سلسلہ میں یہ وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ اس طرح کی نظر ثانی یا مراجعت کے لیے مولانا تھانوی رح نے کبھی صراحۃً یا اشارۃً کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا، تصوف میں ارادت "اتحاد مطلب" کا نام ہے، جب یہ مقام حاصل ہو گیا تو فطری

بات تھی کہ عمل اور عقائد میں جہاں جہاں شیخ کے مسلک سے اختلاف پایا جائے اس پر نظر ثانی کی جائے،
اور سید صاحبؒ نے یہ مراجعت بھی پوری علمی شان اور دلائل کے استناد کے ساتھ کی تھی تصوف میں "اتحاد مطلب" کا
وہی مرتبہ ہے جو شریعت میں "اتباع سنت" کا ہے، جو امور مختص بالنبوۃ ہیں انھیں چھوڑ کر باقی تمام امور میں شیخ
نبی کا قائم مقام ہوتا ہے، سید صاحبؒ نے اس طرح کے اعتراضات سن کر ایک بار کہا تھا "لوگ مجھ کو کہتے تو محقق اور علامہ
ہیں مگر درحقیقت بے عقل جانتے ہیں" اور اگر کبھی کسی نے زیادہ احسان جتایا تو صاف یہ جواب لکھ دیا کہ "جن کمالات
کی بنا پر آپ نے مجھے اپنا قبلہ بنایا تھا ان ہی کمالات نے مجھے مولانا تھانویؒ کے آگے جھکا دیا، میں نے اپنے انجام کی
فکر کر لی اب آپ کو اختیار ہے اپنا قبلہ کوئی اور تجویز کر لیں۔"

تربیت سالک کیلیے مولانا تھانویؒ نے بڑی دقیقہ سنجی اور باریک بینی سے پورا نصاب تیار کیا تھا اس لیے
ان کا تربیت یافتہ کندن ہو کر نکلتا تھا، پھر بھی انھوں نے بیعت و خلافت کیلیے گنے چنے لوگوں ہی کو مجاز کیا اکثر
کو صرف "مجاز صحبت" بنانے پر ہی اکتفا کیا، سید صاحبؒ کو اگر "اجازت بیعت" ملی تو یہ چنداں تعجب کا مقام نہیں جس طرح
انھوں نے علامہ شبلیؒ کے علمی کاموں کو اسی شان کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہونچایا ایسے ہی مولانا تھانوی کا انداز تربیت
اگر کہیں پورا پورا رچا ہوا ملتا ہے تو وہ سید صاحبؒ ہی کے ہاں ملتا ہے، اور اس کی تفصیل مولوی غلام محمد صاحبؒ
کی کتاب "تذکرہ سلیمان" میں دیکھی جا سکتی ہے، مرشد اور مسترشد کے ربطہ کی ایسی واضح، مدلل، بے ریا اور مفصل تصویر دوسری
جگہ ملنی بہت ممتنع ہے، حضرت بابا فریدؒ نے شیخ نظام الدین اولیاءؒ کو خلافت دیتے ہوئے فرمایا تھا "خدا نے
تمھیں علم، عقل اور عشق تینوں جوہر عطا کیے ہیں اور جس میں یہ تینوں جوہر ہوں اس سے مشائخ کی خلافت خوب بنتی ہے"
سید صاحبؒ پر بھی یہی بات صادق ہے، جب سید صاحبؒ مولانا تھانویؒ کے مرید ہو گئے تو ایک محفل میں مولانا
ابو الکلام آزادؒ نے ان سے پوچھا: "سنا ہے آپ مرید ہو گئے ہیں" انھوں نے متانت سے جواب دیا: "جی ہاں" مولانا آزاد نے دوسرا
چبھتا ہوا سوال کیا "آخر اس تصوف میں ہوتا کیا ہے؟" اس کا سید صاحبؒ نے ٹالنے والا جواب دیا کہ "اب یہاں کیا بتاؤں
پھر کبھی بتاؤں گا" مگر دل میں سوچا ہوگا کہ ؎ لطف مے تجھ سے کیا کہوں زاہد ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

(نوٹ) یہ مقالہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے مولانا سید سلیمان ندوی سمینار میں پڑھا گیا۔

حضرت مخدوم قاری نظام الدین شیخ بھکاری کاکورویؒ

از

مسعود انور علوی کاکوروی ریسرچ اسکالر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

نام و نسب مخدوم زادگان علوی، کاکوری کے مورث اعلیٰ حضرت مخدوم نظام الدین قاری قادریؒ کا
شمار عہد اکبری کے نامور مشاہیر علماء و ارباب فضل میں ہوتا ہے، دربار اکبری سے ۹۸۲ھ / ۱۵۷۴ء
میں جاری شدہ ایک فرمان میں ان کے نام نامی کے ساتھ "قاری آبائی نظام الدین شیخ بھیکہ دانشمند"
لکھا ہے، اسی وجہ سے اہل کاکوری اور آپ کی اولاد کی زبان پر شیخ بھیکہ ہے، لیکن ان کے خلفاء کے
مریدین کے شجرۂ طریقت میں بھکاری درج ہے، مرزا شمس الدین خان کو کانے بھی اسی طرف اشارہ
کیا ہے، چنانچہ اپنی مثنوی میں شیخؒ کی شان میں یوں رطب اللسان ہیں:

شاہے کہ نبیرۂ نبیؐ ہست   شاہے کہ نبیرۂ علیؓ ہست
ہادی رہ جناب باریؔ   آں شاہ نظام الدینؒ بھکاری

حضرت مولانا عبد اللہ الرشید ملتانیؒ خلیفہ و مسترشد حضرت مخدومؒ و استاذ حضرت شیخ مجدد
الف ثانی سرہندیؒ زاد الآخرۃ[1] میں رقمطراز ہیں:

---

[1] حضرت موصوفؒ، حضرت مخدوم کے محبوب شاگرد و خلیفہ تھے، زاد الآخرۃ نامی ایک کتاب اپنے شیخ کے حالات میں لکھی تھی، حضرت مجدد الف ثانی نے تفسیر بیضاوی کا درس آپ ہی سے لیا تھا، ملاحظہ ہو کشف المتواری فی حال نظام الدین قاری، حضرت مولانا شاہ تراب علی قلندر علوی ۱۱۲ - ۱۱۹، زاد الآخرت قلمی، کتب خانہ انوریہ خانقاہ کاظمیہ، کاکوری، ۱۲ منہ۔

نسب شریف آں برگزیدۂ خدا جگر بند مرتضیٰ
علوی است، از اولاد امجاد محمد
بن حنفیہ بن امام الاولیاء علی
شیر خدا کرم اللہ وجہہ، وایں اسمائے
متبرکہ بہ تحریر می آرم، اولاً از
زبان حضرت پیر و مرشد و نیز از
زبان فیض ترجمان حضرت جد امجد
قاری امیر سیف الدین رحمہ اللہ مستند
نمودم، بعدہٗ چوں تذکرۂ حمیدی بہ نظر
در آمد ہماں اسمائے متبرکہ از حضرت
محمد بن حنفیہ تا مولانا شمس الدین
محقق بن قاری عبد المجید بہ مقابلہ
در آوردم، سرمو تفاوت نہ یافتم
مابقی اسماء را بہ موجب بیان
حضرتین سند صحیح بلکہ اصح دانستہ
داخل کتاب نمودم و مجموع اسماء
از اسم مبارک حضرت پیر و مرشدنا
حضرت محمد بن حنفیہ بست و یک اسم
یافتم مفصل بریں گونہ، مولانا قاری

اللہ تعالیٰ کے ان برگزیدہ اور حضرت علی رضؓ
مرتضیٰ کے جگر گوشہ کا نسب شریف علوی ہے،
حضرت محمد بن حنفیہ بن امام الاولیاء علی
شیر خدا کرم اللہ وجہہ کی بزرگ اولاد میں سے
ہیں، سلسلۂ نسب کے یہ اسمائے متبرکہ جو میں
لکھ رہا ہوں سب سے پہلے حضرت پیر و مرشد
اور حضرت جد امجد قاری امیر سیف الدین
رحمۃ اللہ علیہ کی زبان فیض ترجمان سے سن کر
مستند قرار دیے، اس کے بعد جب تذکرۂ حمیدی
(مولفہ آقا حمید الدین بدخشی از اصحاب خاص
و شاگرد رشید قاری عبد المجیدؒ) کا مطالعہ کیا
تو حضرت محمد بن حنفیہ سے مولانا شمس الدین محقق
بن قاری عبد المجید تک کے تمام مبارک نام
مقابلہ کیے، سرمو فرق نہ پایا، بقیہ ناموں کو
دونوں حضرات کے بیان کے مطابق درست
بلکہ سب سے درست جان کر کتاب میں شامل
کر لیا، حضرت پیر و مرشد سے حضرت محمد
بن حنفیہؒ تک کے تمام اکیس ۲۱ ناموں کو
اس طرح تفصیل سے پایا (۱) مولانا قاری

نظام الدین بھیکہ المعروف بہ شاہ
بھکاری بن قاری امیر سیف الدین بن قاری
حبیب اللہ نظام الدین المعروف
بہ امیر کلاں بن قاری امیر نصیر الدین
دلیل اللہ بن قاری محمد صدیق المعروف
بہ ابو محمد خانی بن قاری عبید اللہ بن
قاری عبد الصمد بن قاری امیر شمس الدین
خورد المعروف بہ قاری محقق جامع جمع الجوامع
کبیر لغت احادیث و تفاسیر بن قاری عبد المجید
دربان آستانۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
بن حاجی حرمین سلطان حسین بن قاری امیر
ابراہیم نبیرۂ خلیفہ سید عبد الرزاق،
خلف و خلیفہ حضرت غوث الثقلین رضی اللہ
عنہما بن قاری سلطان عبد اللطیف بن
امیر عبید اللہ خانی بن مولانا شمس الدین
صابر بن قاری مجید الدین خانی
بن قاری امیر سلیمان مفسر کہ از
سن سیزدہ ۱۳ سالگی تا نود و دو ۹۲ سالگی
بجز درس تفاسیر بہ علوم غیر دینیہ

نظام الدین بھیکہ المعروف بہ شاہ
بھکاری (۲) بن قاری امیر سیف الدین
(۳) بن قاری حبیب اللہ نظام الدین
امیر کلان (۴) بن قاری امیر نصیر الدین دلیل اللہ
(۵) بن قاری محمد صدیق معروف بہ ابو محمد
خانی (۶) بن قاری عبید اللہ (۷) بن قاری
عبد الصمد (۸) بن قاری امیر شمس الدین خورد،
معروف بہ قاری محقق جامع جمع الجوامع کبیر
لغت احادیث و تفاسیر (۹) بن قاری عبد المجید
دربان آستانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔
(۱۰) بن حاجی حرمین سلطان حسین (۱۱) بن
قاری امیر ابراہیم نواسہ و خلیفہ سید عبد الرزاق
خلف و خلیفہ حضرت غوث الثقلین شیخ
عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہما (۱۲) بن قاری
سلطان عبد اللطیف (۱۳) بن قاری امیر
عبید اللہ خانی (۱۴) بن مولانا شمس الدین صابر
(۱۵) بن قاری مجید الدین خانی (۱۶) بن قاری امیر
سلیمان مفسر جنھوں نے تیرہ ۱۳ سالہ عمر سے بانوے ۹۲
سال تک سوا تفسیر کے درس کسی دوسرے علم کی طرف

نگاہے ہم نہ فرمود بن مولانا وجیہ الدین احمد
بن قاری محمد بن قاری احمد بن علی بن محمد
حنفیہ بن جناب مبارک حضرت
علی مرتضیٰ شیر خدا کرم اللہ وجہہ ورحمہم
اجمعین

نگاہ بھی نہ ڈالی (۱۷) بن مولانا وجیہ الدین احمد
(۱۸) بن قاری محمد (۱۹) بن قاری احمد،
(۲۰) بن علی (۲۱) بن محمد حنفیہ (۲۲) بن
حضرت علی مرتضیٰ شیر خدا کرم اللہ وجہہ ورحمہم
اجمعین۔

(یہاں پر حضرت قاری امیر سیف الدین کے نام گرامی سے ابتداء کرنے سے اکیس ۲۱ پشتیں ہی ہوتی ہیں)

حضرت مخدوم شیخ بھکاریؒ اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی تھے جس کا ہر فرد حضرت علی مرتضیٰ سے لے کر حضرت قاری امیر سیف الدین تک علم و فضل، تقویٰ و پرہیزگاری، صفائی باطن، حفظ شریعت اور دوسرے تمام محامد کا حامل اور آیۃ من آیات اللہ فی الارض تھا، چنانچہ صاحب زاد الآخرۃ تحریر کرتے ہیں:

بعد از تحقیق و تدقیق دریافتم و بمطالعہ کتب
اسمائے رجال و قرائے کلام الٰہی و محدثین
احادیث رسالت پناہی پیشاختم کہ
بایں بزرگواران اللہ تعالیٰ شانہ جدا
جدا عطا فرمودہ است، کمتر کہ از ایشاں
گذشتہ کہ حافظ کلام اللہ و دستاری
ہفت قراءت و عالم و علامہ
و اہل معانی نباشد، و از ایشاں
عجائب قدرت پروردگار

میں نے بڑی چھان بین، اسماء الرجال کی
کتابوں کے مطالعہ نیز قرآن پاک کے قاریوں
اور رسولؐ کی احادیث بیان کرنے والے
محدثین کو پہچاننے کے بعد یہ معلوم کیا ہے
کہ اللہ نے ان تمام بزرگوں کو الگ الگ
شان کا حامل بنایا ہے، ان میں سے شاید ہی
کوئی ایسا گذرا ہو جو کلام پاک کا حافظ سات
قراتوں کا قاری، عالم، علامہ اور اہل معانی
نہ ہو، ان کے ذریعہ پروردگار کی قدرت کے

بظہور آمدہ خصوصاً در طریقۂ استاد
باطن قدم بہ قدم بر طریقہ محمدیہ
ازیں عالم ظاہر بآں عالم معنی رفتہ اند
و ہیچ یکے از علماء و فضلائے عصر زبان
اعتراض بر اقوال و احوال
ایشاں نہ کشادہ۔
الخ

عجائبات ظاہر ہوتے ہیں، خاص طور پر باطنی
معاملات کی پوشیدگی میں تو رسولؐ کے طریقہ پر
قدم بہ قدم اس عالم ظاہر سے عالم معنی تک گئے
(ان کی ساری زندگیاں شرع شریف کے تابع
رہیں) کسی زمانہ میں کسی بھی عالم و فاضل نے
ان کے اقوال و احوال پر کبھی نکتہ چینی
نہیں کی۔ الخ۔

آگے چل کر اس خاندان عالی شان کی فضیلت و بزرگی کو یوں بیان کرتے ہیں:

می گوید فقیر راقم حقا کہ ایں خاندان عالی
شان، را طرزے خاص عجیب است
و دولت حفظ کلام اللہ از زمان حضرت
ابن حنفیہ تا ایں زمان جاری است
و تحقیقات علوم قرآنیہ و درس
و تدریس علم تجوید و تصحیح قراءت از
عہد مولانا قاری احمد کہ خود نبیرۂ خاص
محمد بن حنفیہ ہست بہ دقت و تحقیق تمام
رونق و رواج گرفت الخ

فقیر راقم سطور (عبدالرشید ملتانی) کہتا
ہے کہ یقیناً اس خاندان عالی شان کا ایک
خاص اور عجیب طرز ہے، حضرت محمد بن
حنفیہ سے اس زمانہ تک حفظ کلام مجید کی
دولت جاری و ساری ہے، قرآنی علوم کی
تحقیقات، درس و تدریس، علم تجوید صحت قرات
مولانا قاری احمد کے زمانہ سے جو حضرت محمد
ابن حنفیہؒ کے خاص پوتے تھے، اب تک
جاری اور ترقی پر ہیں۔

"نفحات النسیم فی تحقیق احوال اولاد عبدالکریم" کے مؤلف حضرت مخدومؒ کے اخلاف کے صحیح النسب رہنے کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

"ان ہی چند منتخب قصبات میں قصبہ کاکوری ضلع لکھنؤ کا بھی شمار ہے جس میں بہت سے عربی النسل خاندان آباد ہیں، جن میں سب سے بڑی تعداد سادات علویہ کی ہے، جو حسب و نسب میں اپنے دیگر ہم وطنوں سے ممتاز ہیں، اور بہایت فخر سے دعوی کرتے ہیں کہ جس گراں بہا امانت کی حفاظت ان کے دیگر بنی اعمام کو عربستان کے حدود سے چار قدم آگے بڑھ کر دشوار ہوگئی تھی، حتی کہ خلفائے بغداد میں سے صرف ایک فرماں روا[1] کے متعلق یہ دعوی کیا جا سکتا ہے کہ وہ نجیب الطرفین تھا، یہ اپنے وطن سے منزلوں دور اور ایک اجنبی ملک اور غیر مانوس سرزمین میں اپنے پاک عربی خون کو ویسا ہی صاف اور نوہ بچائے ہیں جیسا کہ وہ نضر[2] بن کنانہ کی رگوں میں تھا۔[3]"

"سخنوران کاکوری" کے مؤلف رقمطراز ہیں:

"مخدوم زادگان کاکوری براہ راست امام محمد بن حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اولاد میں ہیں، محمد بن علیؓ کو سیادت نسبی کے علاوہ سیادت مذہبی اپنے پدر بزرگوار سے جو مجمع العلم تھے، ورثہ میں ملی اور ان کا شمار علم و تقوی کے لحاظ سے کبار تابعین کے فاضل ترین لوگوں میں ہوتا ہے، جہاں تک ہم کو علم ہے اس برصغیر میں سوا علویان کاکوری کے دوسرا کوئی خاندان بلا آمیزش محمد بن علیؓ کی اولاد میں باقی نہیں ہے، علویان کاکوری کے اسلاف نسب کے بارے میں غیر معمولی طور پر محتاط رہے ہیں۔[4]"

مؤلف موصوف کا یہ دعوی خود ان کے لیے، نیز ان علویان کاکوری کے لیے جو ہندوستان اور خصوصاً کاکوری میں موجود ہیں، ایک حد تک درست ہے، تقسیم ہند کے بعد یہاں کے اکثر افراد نے غریب الوطنی کو حب الوطنی پر ترجیح دے کر پاکستان میں اپنی الگ دنیا بسالی، وہاں غیر خاندانوں میں

---

[1] خلیفہ امین الرشید۔ [2] ایک مورخ کا قول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد میں سے نضر بن کنانہ ہی وہ شخص ہیں جن کی اولاد نے قریش کا ہر دلعزیز نام حاصل کیا۔ [3] نفحات النسیم، مولوی سمیع علی علوی کاکوروی (شام اودھ لکھنؤ ۱۳۲۰ھ) ص ۸۔ [4] سخنوران کاکوری مولوی حکیم نثار احمد علوی کاکوروی (کراچی ۱۹۷۰ء) ص ۴۰۰۔

بیاہ شادیاں کیں، اس وجہ سے بیشتر گھرانوں میں نسب کے سلسلہ میں وہ خصوصیت و امتیاز جو علویان کاکوری کا تقریباً پانچ سو سال سے طرۂ امتیاز تھا باقی نہ رہا۔

ہندوستان میں اہل خاندان کی آمد کسی تاریخ میں اس بات کی صراحت نہیں ملتی ہے کہ حضرت مخدومؒ کے اسلاف کرام میں کس نے حجاز مقدس کی سرزمین کو چھوڑا اور کب بغداد و خراسان کے درمیان قصبہ صحرام میں اقامت گزیں ہوئے، "مقدمہ زاد الآخرت" نیز "کشف المتواری فی حال نظام الدین القاری" میں بالتفصیل درج ہے کہ کن وجوہ سے ان کے اسلاف کرام ہندوستان آنے پر مجبور ہوئے، ذیل میں اس عبارت کا ملخص ترجمہ پیش ہے۔

حضرت مخدوم صاحبؒ کے اسلاف قصبہ صحرام کے جو بغداد و خراسان کے درمیان واقع ہے، رہنے والے تھے، یہاں کے اعیان و اشراف ہمیشہ سے علم و فضل اور وجاہت و لیاقت میں ممتاز تھے، یہ لوگ کٹر قسم کے سنی المذہب تھے، ایرانی حکمرانوں کا شیعیت میں غلو اور صحابہ کرامؓ پر سب و شتم پر مجبور کرنے اور ایسا نہ کرنے پر مظالم ڈھانے کی وجہ سے اور جان کے خوف سے خواف اور صحرام کے اکثر خاندان مجبوراً شیعہ ہوگئے، رفتہ رفتہ اس اختلاف سے معاشرت اور باہمی اتحاد و اتفاق میں بڑا خلل پیدا ہوگیا، پھر جب حضرت مخدوم صاحبؒ کے جد امجد (پانچویں پشت) قاری محمد صدیق المعروف بہ ابو محمد خانی بن قاری عبید اللہ کا زمانہ آیا تو ایرانیوں کا مذہب میں تشدد اور مظالم اس قدر بڑھ چکے تھے اور خود اعیان قوم اور خاندان کے دوسرے اعزہ کا غلو، بے رحمی اور سنگدلی اس مرتبہ کو پہونچ چکے تھے کہ الاقارب کالعقارب سچ ثابت ہونے لگا، ننگ و ناموس اور جان و مال کی حفاظت مشکل نظر آنے لگی، بالآخر قاری موصوف برخاستہ خاطر اور دل شکستہ ہو کر جلاوطنی پر آمادہ ہوئے، اپنا گھر بار چھوڑا، اہل و عیال اور بعض اعزہ کو لے کر قصبہ صحرام کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہا، چند ماہ ہرات میں رہے، پھر ملتان آئے اور سال بھر قیام کیا، لیکن وہاں بھی دل نہ لگا تو لاہور آئے اور پانچ سال

اقامت گزین رہے، یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ باوجود ان پریشانیوں، دقتوں اور غریب الوطنی کے باطنی تعلیم اور حدیث و تفسیر کے درس کا کام نہ چھوڑا، جہاں رہے اپنے علم و عرفان سے نہ معلوم کتنی شمعیں جلائیں، ابھی لاہور میں قیام پذیر تھے کہ حاجی محمد خان تاجر نے جو ملک التجار کے نام سے مشہور تھے، اور ابتدا سے ان کے اسلاف اور خاندان کے بڑے ارادت مند و معتقد تھے، تجارت کے سلسلہ میں ہندوستان آنے کا ارادہ کیا، لاہور پہونچے تو حضرت کے قیام کا پتہ چلا، بڑی نیاز مندی سے حاضر خدمت ہوئے، تمام واقعات معلوم کرنے پر عرض کیا کہ میرے ہمراہ "پٹیالہ" چلیں، وہاں کچھ عرصہ قیام کریں، اس دوران میں ہندوستان کے مشرقی حصہ میں سامان تجارت فروخت کر کے واپس آکر جیسا کچھ ہوگا عرض کروں گا، حضرت ان کی درخواست پر مع کنبہ کے پٹیالہ آگئے، اس قصبہ کے لوگوں نے ان کی تشریف آوری کو بڑا غنیمت تصور کیا، حاجی محمد خاں پٹیالہ سے مشرقی اضلاع ہند کی جانب روانہ ہوئے، کچھ عرصہ بعد یہاں سے ایک عریضہ مع زاد راہ اور سفر خرچ کے ارسال خدمت کیا کہ "جہاں تک میں نے چھان بین کی ہے اور پتہ چلایا ہے اس سرزمین پر ملک اودھ سے بہتر مقام شریفوں کی مستقل سکونت کے لیے کہیں نہ ملے گا، جو سلاطین وقت کے مظالم سے محفوظ ہو، مظفر خاں صوبہ دار اودھ جو نہایت نیک وصالح، نیاز مند ہے آپ کی ملازمت وملاقات کا بہت مشتاق ہے۔" جب حضرت نے وہاں سے چلنے کا ارادہ کیا تو وہاں کے شرفاء نے یہ درخواست کی کہ وہ اپنے چھوٹے صاحبزادہ مولانا نجم الدین کو ان کے درمیان رہنے دیں، اور سادات میں سے ایک سید زادی سے نکاح کی پیش کش کی، انھوں نے منظور فرما کر ان کا نکاح کر دیا، چند ہمراہیوں اور صاحب زادہ موصوف کو وہیں چھوڑا اور اپنے بڑے صاحبزادہ حافظ نصیر الدین دلیل اللہ اور دوسرے متعلقین کے ہمراہ اودھ آئے، اور مختلف مقامات پر مقیم رہے۔

کاکوری میں مستقل سکونت بالآخر ان کے صاحبزادہ امیر نصیر الدین دلیل اللہ کے نبیرہ حضرت قاری

امیر سیف الدین (۸۶۷ھ، ۱۴۶۳ء تا ۹۵۹ھ، ۱۵۵۲ء) مع اپنے کل افراد خاندان کے سلطان بہلول لودی (۸۵۵ھ، ۱۴۵۱ء تا ۸۹۴ھ، ۱۴۸۸ء) کے عہد میں کاکوری میں مقیم ہو گئے، اس وقت سے آج تک ان کی اولاد کا وطن یہی قصبہ رہا۔

مولانا عبد الرشید ملتانی مقدمہ زاد الآخرۃ میں قاری امیر سیف الدینؒ کی آمد اور قیام کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

آخر کار در زمان قبلۂ دین و ایمان امام المرشدین
والعارفین حضرت قاری امیر سیف الدین
باستقلال تمام واطمینان واقعی در قصبۂ کاکوری
بہ فراغ حالی وکشادہ بالی صورت استقامت
قرار گرفت، و مثل زمانۂ ماضیۂ اسلاف درس
طلبہ و تعلیم طالبان رونق پذیر گردیدہ اند
دور دور مردمان بنا بر تحقیق علوم
قرآنیہ حاضر آمدند و فوائد کثیر برداشتند،
چون آفتاب جہاں تاب نظامیہ
از مطلع غیب ظہور فرمودہ عالمے را از
ضیائے انوار احسانیہ و خلقے را از
روشنئ جاویدِ غوثیہ منور ساخت
و غلغلۂ جعفری و شورِ جنیدی
باقالیم سبعہ انداخت،

آخر کار اسی زمانہ میں قبلۂ دین و ایمان امام المرشدین
والعارفین حضرت قاری امیر سیف الدینؒ نے
قصبۂ کاکوری میں فارغ البالی اور کشادہ بالی
کے ساتھ مستقل سکونت اختیار کی اور اسلافِ کرام
کے دور ماضی کی یاد تازہ کر دی، طلبائے اہل علم
اور سالکین کی تعلیم و تلقین اور درس و تدریس کی
خوب رونق و ترقی ہوئی، دور دور سے لوگ
علوم قرآنیہ کی تحقیق کے سلسلہ میں حاضر ہوتے،
اور بے شمار فوائد اخذ کرتے، جب آفتاب
عالم تاب نظامیۂ غیب کے افق سے ظاہر
ہوا تو عالم کو اپنے نور احسان کی تابانیوں اور
مخلوق کو اپنی دائمی نصرت و تائید کی ضیا پاشیوں
سے منور کر دیا، اور پھر سے ہفت اقلیم میں غلغلۂ
جعفری اور شور جنیدی کے جھنڈے گاڑ دیے،

ہر امرے بجائے خود وہر نسبتے بہ مقام خود	معلوم ہوتا تھا کہ ہر کام اپنی جگہ اور ہر
بروش صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین متمکن	نسبت اپنے مقام کے اعتبار سے صحابہ
گشت ، اللّٰہمّ زد فزد ولا تنقص بحرمۃ	رضوان اللہ علیہم اجمعین کی روش
النبی الامی وآلہ واصحابہ وبارک وسلم ۔	اور اتباع پر متمکن ہے ۔

ولادت اور تعلیم حضرت مخدومؒ حضرت قاری امیر سیف الدینؒ کے سب سے بڑے بیٹے تھے[1] ۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء کو کاکوری میں متولد ہوئے ۔

حضرت رسالت مآب ارواحنا فداہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں بشارت فرمائی کہ تمھاری تعلیم وتکمیل سات کاملین سے ہوگی ، پانچ کاملین سے عالم ظاہر میں اور دو سے عالم ارواح میں چنانچہ ایسا ہی ہوا ۔

(۱) سب سے پہلے انھوں نے جملہ علوم درسیہ وعلوم تفاسیر قرآن ، علم تجوید وقراءت اور اذکار و اعمال اپنے والد ماجد سے اکتساب کیے ۔

(۲) حضرت مولانا ضیاء الدین محدث مدنی سے حدیث شریف پڑھی اور اس درود پاک کی اجازت حاصل کی جس سے حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے اور آپؐ نے بشارات عطاء فرمائے ۔

(۳) حضرت حاجی عبد اللطیف ہراتی ، ان کی خدمت میں بیس سال رہ کر باطنی تعلیم حاصل کی ذکر پاس انفاس کی تعلیم پائی اور ان ہی کی توجہ سے اسرار باطن کھلے ۔

(۴) حضرت امیر سید ابراہیم ایرجی بن معین الدین ایرجی ، یہ حضرت مخدومؒ کے پیر بیعت و اجازت وخلافت ہیں ، ان ہی کی خدمت میں رہ کر سلوک کے مراحل طے کیے اور دوسرے فوائد حاصل کیے ،

---

[1] آپ کے دو چھوٹے بھائی اور تھے ، انھوں نے صغر سنی میں وفات پائی ، ایک کا نام رشید الدین اور دوسرے کا قطب الدین تھا ،

(۵) حضرت حافظ سید محمد ابراہیم ابن احمد ابن حسن بغدادی ؒ ۔ یہ حضرت مخدومؒ کے پیر طریقت تھے جن سے انھوں نے اذکار واشغال تعلیم پائے ، مشغولی غوثیہ کی تعلیم حاصل کی ، وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے باہمی نزاع کو دور کیا ۔

(۶) حضرت غوث الاعظم شیخ محی الدین عبد القادر جیلانی رضؓ

(۷) حضرت شیخ شہاب الدین ابو حفص عمر سہروردیؒ ، ان دونوں عظیم ہستیوں سے آپ نے اویسی فیوض حاصل کیے ۔

ان کے ایک دوسرے خلیفہ حضرت میر شرف الدین تنکارپوریؒ نے اپنی بیاض میں ان ہی مذکورۂ بالا ساتوں کاملین کے نام اسی طرح تحریر کیے ہیں ،

مؤلف زاد الآخرۃ تحریر کرتے ہیں کہ :

"حضرت مخدومؒ فرماتے تھے کہ میں اکثر حضرت غوث الاعظم رضؓ کی زیارت سے مشرف ہوا ہوں ، مگر میں نے نہ کبھی تنہا حضرت ہی کو دیکھا اور نہ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کو بلکہ دونوں کو ہمیشہ ساتھ ساتھ دیکھا ، گفتگو کرتے وقت بھی حضرت شیخ مذکور کو حضرت غوث الاعظمؒ کے کلام کی اتباع کرتے دیکھا ، کبھی انھوں نے خود کلام نہ فرمایا ، مجھے اس بات پر تردد تھا ، ایک روز اپنے والد (حضرت امیر سیف الدینؒ) سے عرض کیا ، انھوں نے فرمایا "پریشانی کی کیا بات ہے ، حضرت غوث الاعظم رضؓ کو اہل کشف ذو الجناحین (دو بازوؤں والے) کہتے ہیں ، جناح اول شیخ شہاب الدین سہروردی اور جناح دوم شیخ اکبر محی الدین بن عربی ہیں ، چونکہ اس زمانہ میں علم شرایع اور اتباع سنت کی طرف تمھاری ہمت متوجہ ہے ، لہٰذا حضرت شیخ سہروردیؒ حضرت غوث الاعظم کے ہمراہ نظر آتے ہیں ، حضرت غوث الاعظم رضؓ فرماتے تھے کہ میں نے علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دو حصے کر دیے ، علم شرائع واتباع سنت شیخ شہاب الدین سہروردی کو اور علم حقایق ومعارف شیخ محی الدین بن عربی کو دیا ۔

حضرت مخدوم صاحبؒ فرماتے تھے کہ "ایک مرتبہ ماہ رمضان المبارک میں مجھے خیال آیا کہ ایک عرصہ سے حضرت غوث الاعظمؓ کی زیارت نہ ہوئی، تراویح کے بعد سو گیا، دیکھا کہ حضرت تشریف لائے ہیں اور دو شخص اور ساتھ ہیں، ان میں سے ایک شیخ سہروردی ہیں اور دوسرے کو جن پر مستی کا غلبہ تھا، میں نہ پہچان سکا، حضرت سے استفسار کی غرض سے عرض کیا، انھوں نے ان بزرگ سے میری طرف اشارہ کر کے فرمایا ان سے مصافحہ کرو، یہی نظام الدین ہیں، جن کے تم مشتاق تھے، یہی تمھارے کلام کی حمایت کرتے ہیں، انھوں نے ہوشیار ہو کر بڑے تپاک سے مجھ سے مصافحہ اور معانقہ کیا، اور کہا کہ اگر یہ لوگ میرے کلام کی حمایت نہ کریں گے تو کون کرے گا، اور لوگ اس کی قدر کیا جانیں، یہ قاری ابراہیم بغدادی کے پوتے ہیں، تب حضرت غوث الاعظمؓ نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ یہی شیخ محی الدین ابن عربی ہیں، اس کے بعد حضرت غوث الاعظمؒ بیٹھ گئے، داہنی سمت حضرت شیخ سہروردیؒ اور بائیں سمت حضرت شیخ ابن عربی بیٹھے اور مجھے اپنے سامنے بٹھایا، حضرت شیخ اکبر نے مجھ سے کہا کہ تمھارے جد نے معترضین کے جواب میں اچھا رسالہ لکھا ہے، اور تم نے بھی ان سے کم نہیں لکھا، میں نے اس کا جواب حال کے مطابق دیا، اس واقعہ کو میں نے اپنے والد ماجد سے عرض کیا، انھوں نے فرمایا کہ الحمد للہ تم کو مشغول غوثیہ سے بہت اچھا فائدہ ہوا، اس کو جاری رکھو، اس کے طفیل میں حقیقت مراتب غوثیہ سے بھی آگہی ہوگی"۔

بیعت اور عنایات مرشدی | جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے، ان کو بیعت حضرت امیر سید ابراہیم ایرجی[1] بن

[1] حضرت امیر سید ابراہیم ایرجی اپنے عہد کے سرآمد روزگار عالم اور صاحب باطن تھے، بکثرت علوم کی مشکل کتابوں کی شرح فرمائی، ان کے عہد میں دہلی میں کوئی ان کا ہم پایہ نہ تھا، حضرت شیخ بہاء الدین شطاری قادری سے بیعت تھے، کہا جاتا ہے کہ شیخ موصوف نے "رسالہ در طریق شطاریہ" ان ہی کے واسطے تصنیف کیا تھا، حضرت شیخ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ سے معاملہ میں خرقہ حاصل کیا، ۹۲۰ھ/۱۵۱۴ء میں دہلی تشریف لائے ۹۵۳ھ/۱۵۴۶ء میں دہلی میں وفات پائی اور حضرت محبوب الٰہیؒ کی درگاہ میں پائیں حضرت امیر خسروؒ آسودہ ہوئے، راقم الحروف اکثر حاضر ہوتا رہتا ہے، سامنے دالان کی کھڑکی ہے جس سے مزار شریف نظر آتا ہے، جناب حسن ثانی نظامی صاحب کی تحویل میں ہے، ۱۲ منہ

سید معین الدین ایرجی حسنی حسینی سے تھی، اذکار و اشغال صوفیہ کی تعلیم انھوں نے اپنے والد ماجد سے پائی تھی اور ان ہی کے حسب ارشاد حضرت میر سید ابراہیم ایرجی سے بیعت کی۔

حضرت مخدوم صاحبؒ فرماتے تھے کہ جب میں حضرت امیر ابراہیم ایرجی سے فیروز آباد میں بیعت ہوا تو حضرت نے ایسے عنایات فرمائے جو بیان سے باہر ہیں، چند ماہ خدمت اقدس میں رہا، روزانہ کوئی نہ کوئی نیا انکشاف ضرور ہوتا تھا، درس و تدریس اور گذشتہ اذکار و اشغال وغیرہ کو دریافت فرماتے اور احادیث کے درس کے وقت بھی مجھ کو یاد فرماتے، نماز بھی مجھ ہی سے پڑھواتے، اور فرماتے کہ تم سے قرات خوب ادا ہوتی ہے، آواز بھی عمدہ ہے، تمھارے آنے سے مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے،

فرماتے تھے کہ ایک روز مجھ سے دریافت فرمایا کہ انما الاعمال بالنیات[1] کے کیا معنی ہیں؟ میں نے بیان کیے، اس وقت حضرت پر ایک کیفیت طاری ہوگئی، فرمایا پھر کہو اور اپنے سر مبارک سے ٹوپی اتار کر میرے سر پر رکھ دی اور فرمایا کہ حدیث کے معنی بیان کرنے کے لیے ایسا ہی اچھا منھ چاہیے، پھر روزانہ کے وظائف دریافت کر کے اپنی کتاب اوراد اور حضرت سید احمد بغدادیؒ کا پیرہن عطا فرمایا۔

چند روز فیروز آباد میں مقیم رہ کر حضرت مخدومؒ وطن تشریف لائے اور والد ماجد سے سارا حال بیان کیا، انھوں نے سن کر بہت دعائیں دیں، پھر تھوڑے دنوں بعد معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم ایرجی فیروز آباد سے چرکھاری تشریف لائے ہیں، اور وہاں سے دہلی جائیں گے، والد ماجد کے حکم سے آپ چرکھاری گئے، دو ماہ پیر و مرشد کے ساتھ قیام کیا، اس مرتبہ بھی حسب سابق بہت عنایات ہوئے، ایک روز آپ نے ان سے مشغولی ارسال غوثیہ کے متعلق عرض کیا، انھوں نے ارشاد فرمایا کہ میرا ارادہ خود بتانے کا تھا، مجھے تم سے جس قدر تعلق ہے، وہ تم خود جانتے ہو، جو کچھ میں نے اپنے پیر و مرشد

[1] اعمال کا دار و مدار نیتوں ہی پر ہے، ۱۲ منہ۔

شیخ بہاء الدین انصاری سے حاصل کیا وہ سب تم کو بتلا دیا اور دے دیا، اب تک صرف دو چیزیں ملتوی رکھی ہیں؛ ایک مثال، دوسری مشغولی، یہ اس مصلحت سے کہ اس کو اپنے مرشد کے مخدوم زادہ حضرت حافظ سید ابراہیم بغدادی کے ہاتھ سے دلوانا چاہتا ہوں اور اپنی دستخطی مثال تم کو بوقت رخصت دے دوں گا، تمھاری تکمیل ان ہی سے ہوگی، چونکہ تمھارا اسم عالم معانی میں بارہواں ہے جیسا کہ حضرت غوث الاعظمؓ کا بہ وساطت شجرۂ آبائی بارھواں اسم تھا لہٰذا نعمت غوثیہ تم کو ان ہی کے ہاتھ سے ملے گی، اور وہ عنقریب ہندوستان آنے والے ہیں، تم ان کی تشریف آوری کے منتظر رہو، میرا ارادہ دہلی جانے کا ہے، تم کو وطن رخصت کرکے دہلی چلا جاؤں گا، دوسرے روز انھوں نے کتبہ مع وصایا و مثال مہری عطا کرکے وطن جانے کی اجازت دے دی، چنانچہ وہ وطن تشریف لائے، اور اپنے والد ماجد سے کل کیفیت بیان کی، وہ بہت خوش ہوئے، اور فرمایا کہ اس طرف میں نے سید عبدالرحیم مجذوب کو خواب میں دیکھا تھا، انھوں نے مجھ سے کہا کہ ایک سید مغرب سے آئے گا اور تمھارے لڑکے کو بارہ[12] آم دے گا، تنہا خوری نہ کرنا، پھر کہا کہ جیسا تمھارا لڑکا ویسا میرا لڑکا۔

اس بشارت سے حضرت سید ابراہیم ایرجیؒ کے کلام کی تصدیق ہوئی، حضرت غوث الاعظمؓ کے اسم مبارک کی طرف اشارہ بھی امر واقعی تھا جسے حضرت سید عبدالرزاق نے اپنے رسالہ "ملہمات قادری" میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے، نیز مشغولی ارسال غوثیہ کے متعلق بھی حضرت غوث الاعظمؓ سے تحقیق کرکے لکھا ہے کہ وہ فرماتے تھے حضرت خضرؑ سے مجھے اس مشغولی کی تلقین ہوئی، اسی وجہ سے اس کو مشغولی ارسال بھی کہتے ہیں،

سید ابراہیم بغدادیؒ سے ملاقات حضرت مخدومؒ اپنے پیر و مرشد کے ارشاد اور سید عبدالرحیم مجذوب کے بشارات کے بعد سے برابر سید ابراہیم بغدادی کی آمد کے منتظر رہتے، مغرب کی جانب سے ہر آنے والے سے دریافت فرماتے رہتے، جب حضرت موصوف کا لاہور سے آگرہ وغیرہ ہوتے ہوئے جھانسی تشریف لے جانا معلوم ہوا

تو وہ بھی کاکوری سے دس بارہ ساتھیوں کے ہمراہ جھانسی تشریف لے گئے، وہاں سید صاحب کی یہ حالت تھی کہ ہر شخص سے حضرت مخدومؒ کے خاندان کا حال دریافت کرتے رہتے، کیونکہ بغداد سے چلتے وقت حضرت سید احمد بغدادیؒ نے اُن سے فرما دیا تھا کہ ہندوستان پہونچ کر قاری امیر ابراہیم نواسۂ حضرت سید عبدالرزاق ابن غوث الاعظمؓ کی اولاد کا حال ضرور دریافت کرنا، اگر ان میں کوئی ملاقات معلوم ہو تو ملاقات کرنا۔

حضرت مخدوم صاحب اسی حالت انتظار میں سید ابراہیم بغدادی کی خدمت میں جھانسی پہونچے، ملتے ہی حضرت سید صاحبؒ نے بڑی مسرت سے معانقہ کرکے فرمایا ع

یار در خانہ و من گرد جہاں می گردم

غور سے دیکھ کر فرمایا کہ والد ماجد کا کیا نام ہے؟ انھوں نے بتایا، سید صاحب موصوف نے حاضرین محفل (جن میں وہاں کے عمائدین بھی تھے) کے استعجاب و حیرت کو ملاحظہ کرکے اُن کے خاندانی خصوصیات بیان فرمائے، اکثر حاضرین نے یہ سن کر نیازمندانہ دست بوسی کی، سید صاحب نے ان کے قیام کے لیے ایک مکان اپنی قیام گاہ کے متصل تجویز فرمایا، وہاں انھوں نے قیام کیا، سید صاحبؒ نے مہمان داری میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا، دوسرے روز نماز اشراق کے بعد تمام گذشتہ واقعات و حالات دریافت کیے، انھوں نے تمام واقعات بیان کیے، انھوں نے فرمایا کہ عنقریب کالپی پہونچ کر اعتکاف کی جگہ مقرر کرکے مشغولی ارسالِ غوثیہ کی اجازت دی جائے گی، کیونکہ مقررہ ضابطہ اعتکاف کی شرائط کے ساتھ مشروط ہے، بالفعل رسالۂ ملہمات قادری دیکھو۔

دوسرے ہی روز کتاب عطا ہوئی، انھوں نے دیکھنا شروع کیا، سب سے پہلے مشغولی ارسالِ غوثیہ ہی کا ذکر تھا، پھر اور بہت سے اسرار و رموز اور نکات تصوف تھے، خود فرماتے تھے کہ اس کتاب کے مطالعہ کے وقت جو انوار و برکات نازل ہوتے تھے ان کا بیان ممکن ہی نہیں،

حضرت سید صاحبؒ کے ہمراہ بیس روز جھانسی میں مقیم رہے، اس عرصہ میں اس رسالہ اور اس سے ہونے والے فوائد و مکاشفات کے سلسلہ میں خود فرماتے کہ

تامدت بست روز کہ تشریف بہ مقام جھانسی	حضرت نے بیس روز جھانسی میں قیام فرمایا،
ارزانی داشتند، فقیر را جز مطالعہ آں رسالہ	اس عرصہ میں فقیر کے سوا اس رسالہ (ملمہات قادری)
کارے دیگر نہ بود، چوں خوب غور	کے مطالعہ کے اور کوئی کام نہ تھا، جب خوب
می نمودم با ایں ہمہ نارسائی ذہن البتہ	غور و فکر کیا تو باوجود اس نارسائی ذہن کے
ایں قدر سراغ می بردم کہ مقام حضرت	اس قدر پتہ چلا کہ حضرت غوث پاک کا علوم
غوث پاک بہ علوم عرفانیہ بالاتر از مقام	عرفانی میں تمام عارفین سے بلند و برتر مقام
جمیع عرفا است، و بلندی مراتب جمیع صوفیۂ	ہے، تمام صوفیہ صاف باطن کے مراتب کی
صافیہ از مطالعہ و ملاحظہ کلمات طیبات	بلندی اس رسالہ کے مطالعہ و ملاحظہ سے
غوثیہ عیاں و آشکارا می دیدم۔	میں نے واضح طور پر دیکھی۔

ایک روز استفسار کیا کہ "عوالم المعالم" بھی دیکھی ہے، عرض کیا کہ عرصہ ہوا جب حضرت والد ماجد سے شرح ابراہیمی جو قاری امیر ابراہیمؒ نے اس کتاب پر لکھی ہے وہ بھی اور عوالم المعالم بھی پڑھی تھی، ارشاد فرمایا کہ "شرح ابراہیمی" بھی میرے ساتھ ہے، کالپی پہونچ کر درس ہوگا، میرے والد حضرت سید احمد صاحبؒ کا ارشاد ہے کہ جس نے عوالم المعالم بہ غور نہ پڑھی اس کو ملمہات کے سمجھنے میں دقت ہوگی، الحمد للہ کہ تم عوالم المعالم پڑھ چکے ہو، انھوں نے عرض کیا کہ کتاب کے مطالب سمجھنے کے لیے ذہن عالی درکار ہے، جب تک ان کی توجہ نہ ہو مجھ میں ایسی قابلیت نہیں، وہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ اس راہ مستی میں مستی ہی راہبر ہے، جس شخص کا سرمایہ مستی ہے اس کے لیے ہستی حق دم نقد ہے۔

کچھ روز بعد حضرت کے ہمراہ کالپی تشریف لائے، سید صاحبؒ نے ایک پرانی مسجد اعتکاف کے لیے

تجویز فرمائی، اعتکاف کا حکم دیا، اور اعتکاف کے شرائط ایک پرچہ پر لکھ کر مرحمت فرمائے، یکم ذی قعدہ سے اعتکاف شروع ہوا، سید صاحبؒ روزانہ رات کو پیادہ پا جائے اعتکاف پر تشریف لاتے جو جائے قیام سے ایک میل کے فاصلہ پر تھی، اور واقعات دریافت فرماتے، جب عید الاضحیٰ کے روز اعتکاف سے فراغت ہوگئی تو اس روز ان کی مسرت کی انتہا نہ رہی جو پاس آتا اسے فوراً حضرت مخدومؒ کے پاس بھیجتے، اور نذر دلواتے، اعتکاف سے فراغت کے بعد اپنے مکان سے متصل ایک مکان قیام کے واسطے تجویز فرمایا۔

سید صاحب روزانہ بعد نماز صبح مشغولی تلقین فرماتے، پھر شرح عوالم جنیدی مع ملمہات کا درس دیتے، بعد نماز ظہر تفسیر معالم و بخاری شریف سنتے، اور بعد عصر سبعات عشر قادری پڑھواتے، پھر مغرب تک خاموشی کے ساتھ پاس انفاس اور اسم ذات کے ذکر خفی کا حکم فرماتے، اور بعد مغرب تا عشاء کلام مجید کی تلاوت کراتے تھے،

حضرت شاہ تراب علی قلندر کاکورویؒ نے کشف المتواری میں مذکورہ بالا تمام واقعات درج فرمائے ہیں۔

غرضیکہ حضرت مخدوم صاحبؒ چھ مہینہ حاضر خدمت رہے، اس کے بعد وطن آنے کی اجازت چاہی، انھوں نے مجبوراً حضرت قاری امیر سیف الدینؒ کی پیرانہ سالی اور ضعف کا لحاظ کرکے دو[۲] ماہ کی اجازت عطا فرمائی، مگر اس کے بعد واپسی کی تاکید بھی فرمائی، رخصت کرتے وقت حضرت سید احمد کی کلاہ مبارک اور اجازت نامہ اپنے دست مبارک سے لکھ کر عطا کیے۔

حضرت مخدومؒ رخصت ہوکر کاکوری پہونچے، والد ماجد کی قدم بوسی کے بعد سفر و حضر کے تمام حالات و واقعات عرض کیے، سن کر فرمایا: نظام الدین! راہ سلوک میں سب سے علیحدہ اور حق سے ملا رہنا چاہیے دو[۲] ماہ کے بعد ہی فوراً حضرت سید صاحبؒ کی خدمت میں واپس جاؤ، اور ایسے جوان مبارک کی سرشت

کی صحبت کو اپنے حق میں کبریت احمر سمجھو، میری دلی تمنا ہے کہ اللہ تم کو میری حسب منشا میری زندگی ہی
میں اس منصب عالی پر فائز کرے۔

وہ دو۲ مہینے سے بیشتر ہی سید صاحب کی خدمت میں واپس پہونچے اور مزید عنایات سے سرفراز
ہوئے، اسی مکان میں قیام کا حکم ہوا، ہر روز نئی نئی کرامتوں کا ظہور ہوتا، اسی اثنا میں انھوں نے حسب الحکم
حضرت سید صاحبؒ کی کتاب ملہمات قادری کا فارسی ترجمہ شروع کیا، دوران ترجمہ اکثر سید صاحبؒ
اسے ملاحظہ کرتے، بعد میں فرماتے کہ اس قدر دقیق اسرار و رموز ہونے کے باوجود تمھارے لیے اس کا ترجمہ
ایسا آسان ہے کہ قلم برداشتہ عربی سے فارسی میں کرتے جاتے ہو، دو ماہ میں ترجمہ ختم کرکے سید صاحب کی
خدمت میں پیش کیا، انھوں نے بہت پسند کیا، پھر وطن آئے، اور پھر دو۲ ماہ تین۳ ماہ بعد سہ بارہ اسی طرح
حاضر خدمت ہوئے۔

چوتھی مرتبہ کی حاضری میں سید صاحبؒ نے فرمایا کہ ان بزرگان ہند کے آثارات (مزارات وغیرہ) کی
زیارت جو اس ضلع میں جنوب کی جانب واقع ہیں کرنا چاہیے، پھر ملک دکن گئے، وہاں اور دیگر بزرگوں
کے علاوہ چالیس۴۰ ابدالوں سے ملاقات ہوئی، جنھوں نے بہت سی بشارتیں دیں، وہاں سے واپسی پر
ارشاد ہوا کہ قصبے میں کلام مجید کے دورہ کے بعد معالم التنزیل اور جامع الاصول کا درس بہت ضروری
ہے، ایک روز حاضری کی مدت کے متعلق دریافت کیا کہ کتنے عرصے سے حضرت والد ماجد کی خدمت میں حاضر
نہ ہوئے، انھوں نے عرض کیا، فرمایا تمھاری جدائی ایک ماہ سے زیادہ نہیں چاہتا، چار ماہ یہاں اور ایک
ماہ والد ماجد کے پاس، اچھا آج اخلاص و محبت کی احادیث بیان کرو، کیونکہ اس عالم کی پیدائش کا
مقصد ہی اکتساب محبت و تحصیل اخلاص ہے، تمام محققین کی تصانیف کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو مذکورۂ
بالا دو چیزوں کے علاوہ کچھ نہ ملے گا، آپ نے بیان کرنا شروع کیں، حاضرین محفل پر ناقابل بیان کیفیت
طاری ہو گئی، خود سید صاحبؒ پر ایسا استغراق ہوا کہ تمام محفل بیہوش ہو گئی، بعد استغراق انھوں نے

کمر بند غوثیہ آپ کو عطا فرمایا اور فجر کی نماز آپ ہی کے اقتدا میں پڑھی اور فرمایا کہ تم کو اپنے جد حضرت
ابراہیمؒ کا منصب ملا ہے، جس روز میرے جد حضرت عبدالرزاقؒ نے قاری امیر ابراہیم کو مسند خلافت
پر بٹھایا تھا تو وہ عید اضحٰی کا دن تھا، پہلے نماز عید کی امامت کا حکم ہوا، اس کے بعد سندیل اور کمر بند
غوثیہ دے کر مسند خلافت پر بٹھایا، حاضرین کو حکم دیا کہ قاری کو نذر دیں، آج تم اپنے جد کی وراثت سے
ان کے قائم مقام ہوئے ہو، اس لیے تم ہی امامت کرو، انھوں نے عرض معروض کی، فرمایا: خاکساری
خدا کے یہاں مقبول و پسندیدہ ہے، خدا انجام بخیر کرے گا، مگر نماز پڑھاؤ، آپ نے حسب ارشاد
نماز پڑھائی، نماز کے بعد انھوں نے خدام سے فرمایا کہ وہ خوان لاؤ جو دو۲ روز قبل سے اسی لیے میں نے
رکھے تھے، چنانچہ پچاس خوانوں میں مصری کے کوزے حاضر کیے گئے، ارشاد فرمایا کہ ان پر حضرت رسول
مقبول سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام پیران سلسلہ کا فاتحہ ہو، چنانچہ فاتحہ کے بعد پانچ خوان
ان کو کاکوری میں تقسیم کے واسطے عطا کیے، باقی نصف حاضرین مجلس اور نصف رؤسائے کالپی کو
تقسیم کیے گئے۔

سید صاحب کی کاکوری آمد جب وہ رخصت ہونے لگے تو مہر شدہ مثال، ارسال غوثیہ کے ضوابط اور
اوراد و وظائف کا مجموعہ بہت خوشخط خط نسخ میں عطا فرمائے، اور معانقہ و مصافحہ کرکے رخصت
فرمایا، کاکوری آکر آپ نے سید صاحبؒ کا کاکوری آنے کا ارادہ اور (والد ماجد) قاری امیر سیف الدینؒ
سے ملاقات کے اشتیاق کا ذکر کیا، وہ بہت خوش ہوئے، اور مہمان داری کے انتظامات شروع
کر دیے، چنانچہ حضرت مخدومؒ کالپی حاضر ہو کر ان کو اپنے ہمراہ لائے، قاری امیر سیف الدین نے آمد
کی خبر سن کر حضرت مخدوم کے بیٹے اور اپنے پوتے حافظ شہاب الدین المعروف بہ شیخ سونڈھن کو مع دیگر
اشخاص پیشوائی کی غرض سے بھیجا، سید صاحبؒ نے صاحبزادہ پر بہت شفقت فرمائی اور کاکوری تشریف
لا کر قاری امیر سیف الدین سے ملاقات کی، سید صاحبؒ کی آمد کی خبر سن کر حضرت مخدوم صاحبؒ کے

مریدین مختلف مقامات سے آنے لگے، قرب وجوار کے بہت سے عمائدین جمع ہوئے اور سب نے بزرگوں کے آداب کے موافق نذریں پیش کیں، منعم خان، نجیب خان داروغۂ اصطبل شاہی مرزا یعقوب خان، محمد شریف خاں سمرقندی اور قیام الدین خان جیسے مریدین حضرت مخدوم نے خدمت گذاری میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا۔

سید صاحب بیس روز کاکوری میں مقیم رہے، اس کے بعد قاری امیر سیف الدین سے اجازت چاہی، آپ نے جواب میں کہا کہ اگرچہ اہل کالپی آپ کی آمد اور بابرکت صحبت کے بڑے مشتاق ہیں لیکن یہاں بھی ایک عالم کو آپ اپنی ذات سے بہرہ مند فرمارہے ہیں، میری خواہش ہے کہ ابھی آپ مزید قیام کریں، سید صاحبؒ نے جواب میں فرمایا بہتر ہے، آپ کا فرمان میرے لیے بمنزلہ میرے والد ماجد کے فرمان کے ہے، چنانچہ پانچ روز اور مزید قیام فرمارہے۔

حضرت مخدومؒ کا سفر کالپی

سید صاحب جب تک کالپی میں مقیم رہے سال میں ایک دوبار حضرت مخدومؒ تشریف لے جاتے اور مہینوں ان کی صحبت میں رہتے، ایک مرتبہ سید صاحبؒ کا ایک مکتوب گرامی اس مضمون کا پہونچا کہ رمضان شریف کا ایک ماہ باقی ہے، بغداد شریف کے چند قاری اور قاری محمد شریف مدنی یہاں آئے ہوئے ہیں، تمہاری ملاقات کے مشتاق ہیں، حضرت مخدومؒ حسب الطلب کاکوری سے مع مولانا عبدالرشید ملتانی، شیخ بدیع الدین مانک پوری، مولوی نصیر الدین سنبھلی اور حافظ محب اللہ خیرآبادی تشریف لے گئے، راستہ میں کچھ روز قاضی ضیاء الدین المعروف بہ قاضی جیا نیوتنوی کے مکان پر قیام فرمایا، پھر وہاں سے روانہ ہوکر چھ روز میں کالپی پہونچے، چونکہ مخدوم صاحبؒ قراءت کلام مجید میں بھی یکتائے زمانہ تھے اس لیے سید صاحب نے رمضان شریف کے دنوں کی اس طرح تقسیم فرمائی کہ پہلے عشرہ میں آپ پڑھیں، دوسرے میں قاری محمد شریف مدنی اور تیسرے عشرہ میں قاری حمید الدین بغدادی، اور بعد مغرب اوابین میں ایک پارہ قاری مبارک اللہ بغدادی پڑھیں،

چنانچہ آپ نے حسب الحکم پڑھنا شروع کیا، ایک سو ستر سامعین تھے، نماز کی حالت میں سامعین پر وہ استغراقی اور بےخودی کی کیفیت طاری ہوئی کہ اگر فرض الٰہی اور سنن نبوی کی ادائیگی میں ادب شرط نہ ہوتا تو شاید وہ فوراً بےخودی میں اپنے کپڑے پھاڑ دیتے، اور مسجد کی دیواروں سے سر پھوڑ دیتے، تراویح کے وقت قاری محمد شریف مدنی نے اپنی جگہ سے کھڑے ہوکر آپ سے مصافحہ کیا اور فرمایا: مولانا قاری نظام الدین کون کہہ سکتا ہے کہ تم ہندی ہو، تم تو فخر اہل مدینہ ہو، تجوید کے دقائق کی جیسی رعایت شد و مد اور خوش الحانی تم میں ہے وہ کسی میں نہیں، حق یہ ہے کہ تم اپنا مثل نہیں رکھتے۔

ایک روز قاری محمد شریف مدنی نے سید صاحب سے عرض کیا کہ میں نے سنا ہے کہ مولانا (قاری نظام الدین) کو حضرت شیخ اکبر ابن عربی کی تصنیفات پر بڑا عبور ہے، اگر رمضان شریف کے بعد فصوص الحکم کا بیان کسی وقت مقررہ پر ہوا کرے تو بہت اچھا ہے، سید صاحبؒ نے ان سے فرمایا کہ مولانا! مہمان کی خاطر ضرور کرنا چاہیے، دوسری شوال سے حسب الحکم ظہر کے بعد پہلے تبرکاً جامع الاصول کا درس اور اس کے بعد فصوص الحکم کا بیان شروع ہوا، پہلے ہی روز انہوں نے ایسی بسیط و جامع تقریر فرمائی کہ سامعین حیران و ششدر رہ گئے، ایک جملہ کتاب مذکور کا اور دس بارہ قرآنی آیات اور اسی قدر احادیث سے اس کی (فصوص الحکم کی عبارت) ایسی تطبیق فرمائی، جس سے تمام لوگ اور خود سید صاحب موصوف بہت مسرور ہوئے۔

حضرت قاری محمد شریف مدنی جب اپنے وطن واپس ہوئے تو راستہ میں حضرت خواجہ امکنگیؒ سے بیان کیا کہ میں نے اس سفر میں ایک بزرگ سے ملاقات کی جو جامع صفات ہے، جسے سید الطائفہ جنید بغدادیؒ کا ادب، امام ابوحنیفہؒ کا تقویٰ اور تجوید قرائے سبعہ سابقین دیکھنا منظور ہو تو وہ مولانا قاری نظام الدین کو دیکھے، ان سب کمالات کے باوجود بجز نشان عبودیت اور کچھ نہیں، اس واقعہ کو حضرت خواجہ باقی باللہ دہلویؒ نے اپنے پیر حضرت خواجہ امکنگیؒ سے سن کر

حضرت ملا عبدالکریم نبیرۂ حضرت مخدوم نظام الدین قاریؒ سے اپنے خلیفۂ خاص حضرت شیخ مجدّد الف ثانی سرہندی کے مواجہہ سے بیان فرمایا تھا۔

حضرت مخدومؒ ابھی کالپی ہی میں تھے کہ ان کے والد ماجد کا مکتوب گرامی پہونچا جس سے ان کی علالت کا پتہ چلا، چنانچہ سید صاحب نے حضرت مخدومؒ کو رخصت فرمایا۔ (یہ واقعہ ۲۹ شوال ۹۵۹ھ کا ہے) واپسی پر راستہ میں شاہ عبدالرحیم مجذوبؒ سے جو ان کے والد ماجد کے احباب میں سے تھے، ملاقات کی، اپنے والد ماجد کے حسب ارشاد راستہ میں ان مجذوب صاحبؒ کے متعلق لوگوں سے دریافت کرتے رہے، معلوم ہوا کہ قریب میں ایک بزرگ ہیں تو مگر ان کا سارا وقت جنگل کے گشت میں گذرتا ہے، کبھی گاؤں میں آکر باب اللہ تکیہ دار کے مکان پر قیام کرتے ہیں، یہ سن کر وہ مرزا شمس الدین خان کوکا اور مولانا عبدالرشید ملتانی کے ہمراہ مکان مذکور پر پہونچے، دیکھا ایک برہنہ شخص بیٹھے ہوئے بڑ مار رہے ہیں، بالکل قریب جاکر سلام کیا، انھوں نے نہایت ہی کڑک کر جواب دیا اور پھر فرمایا: آؤ بھتیجے! پھر کہا: نظام! مسئلہ تیسیر باد رصوفیان تو پڑھ چکا، اچھا پڑھا۔ حضرت نے کھڑے ہوکر سلام کیا پھر بیٹھ گئے، انھوں نے پھر کہا تو نے عرب کے قاریوں کے سامنے کتاب نصوص الحکم بھی خوب پڑھی، اب میرے پاس سامنے فص محمدی پڑھو، انھوں نے پڑھنا شروع کیا، مطالب کسی کی سمجھ میں نہ آئے، تقریر کے اختتام کے بعد انھوں نے ہاتھ اٹھاکر دعا مانگی کہ "جو کچھ سنت ہے، فرض ہو، اور جو فرض ہے وہ سب کچھ ہو، آمین آمین آمین، اس کے بعد فرمایا: نظام! میرا بھائی تیرے انتظار میں ہے، جلد جا، میرا سلام کہنا اور کہنا کہ جو کچھ میرے پاس تھا وہ میں نے تیرے لڑکے کو دے دیا۔

حضرت مخدومؒ ان سے رخصت ہوکر روانہ ہوئے، مرزا شمس الدین خاں کوکا کو یہ کہہ کر کہ تم کو بہت روز لگ گئے، آگرہ روانہ فرمادیا، ۵ ذی قعدہ ۹۵۹ھ کو کاکوری پہونچے اور والد ماجد سے

تمام سفر کی کیفیتیں بیان کیں، انھوں نے یہ دعا دی کہ

یارب العزت! ہر نعمتے کہ باسلاف ما دادی	اے رب العزت! تو نے جو نعمتیں ہمارے
امید دارم کہ اولاد ما نیز از اں نعمت	بزرگوں کو عطا کیں، امید کرتا ہوں کہ ہماری
بہرہ ور باشند۔	اولاد بھی اُن سے بہرہ ور ہوگی۔

اسی روز ان کے والد ماجد نے وصال فرمایا، اس طرح شاہ عبدالرحیم مجذوبؒ کا وہ قول کہ اے نظام جلد برو، برادرم بہ انتظار تو نشستہ است الخ (نظام جلدی جاؤ میرا بھائی تمہارے ہی انتظار میں بیٹھا ہے) بالکل درست نکلا۔

ارشادات: ان کے ارشادات بہت عالی ہیں، جن سے ان کے مقام ارشاد کا بھی اندازہ ہوتا ہے، ان میں سے کچھ وہ ہیں جن کا تعلق خود ان کی ذات مقدس سے متعلق ہے، اور جن کو انھوں نے بطور حکایت بیان فرمایا، حضرت شاہ تراب علی قلندر علوی نے ان ارشادات کو بالتفصیل بیان کیا ہے۔

فرماتے تھے کہ دس[۱۰] سال کی عمر میں میں نے کلام مجید حفظ کرکے درسی کتابیں پڑھنا شروع کیں چودہ[۱۴] برس میں فارغ التحصیل ہوگیا، اس کے بعد مولانا ضیاء الدین محدث مدنی سے حدیث پڑھی، انھوں نے ایک روز اثنائے درس میں درود شریف کی اجازت دی جس کے پڑھنے سے مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی۔

وہ وفور اخلاق اور کمال اتباع خصائل محمدی کی وجہ سے ہر شخص سے تعظیمی الفاظ سے مخاطب ہوتے، اکثر فرمایا کرتے کہ وہ لوگ قابل افسوس ہیں جو اپنے اخلاق سے لوگوں کے قلوب کو خوش نہیں رکھتے، حالانکہ قلوب کا خوش رکھنا از روئے نصوص اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی دلیل ہے۔

فرماتے تھے کہ ایک روز لڑکپن میں میں نے کہا کہ مجھے اُن لوگوں پر سخت تعجب ہوتا ہے، جو

حرمین شریفین جاتے اور وہاں سے واپس آجاتے ہیں، اگر مجھے یہ سعادت نصیب ہو تو میں مدت العمر واپس نہ آؤں، اس کا جواب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں یہ دیا کہ تم جو زیارت کعبہ شریف کر کے پھر واپس جانا نہیں چاہتے، تو ایسا نہ کرو، تم کو ہندوستان میں رہنا چاہیے، تاکہ تم سے لوگ استفادہ کریں، تم وہاں جو عقد کروگے اس سے صالح، نیک اور باخدا اولاد پیدا ہوگی، یہ فرما کر میرے سر پر ہاتھ رکھا، جس سے میرا دماغ ایسا معطر ہوا کہ میں بے خود ہوگیا، پھر دست مبارک سے سر کو حرکت دے کر فرمایا کہ بے خود ہونا آسان اور باخود وباخدا ہونا مشکل ہے، بندۂ ساقط الخدمت سے معبود کا کام ٹھیک نہیں بنتا، خدا کا شکر کرو جس نے تم کو اس قدر قوی استعداد عطا کی ہے، صرف ہمت رجال سبعہ کاملین (وہی ساتوں کاملین مذکور) سے تمھاری تکمیل ہوگی، اور اسی وقت مرتبۂ احسان کی حقیقت تم پر منکشف ہوگی، پھر دست مبارک سینہ پر رکھ کر فرمایا کہ اس کی تفصیل دوسرے وقت پر موقوف ہے، اس کے بعد سینہ پر سے دست مبارک داہنی جانب اور داہنی جانب سے بائیں جانب پھیر کر کلمۂ سابقہ مکرر فرمایا، اس کے بعد دست مبارک اٹھا کر یہ آیت پڑھی:

سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا	تمھارے عزت و بزرگی والے رب کو
يَصِفُوْنَ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ	کافروں کی باتوں سے پاکی ہے، پیغمبروں پر
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔	سلام اور تمام عالم کے پالنے والے اللہ
	کے لیے ہی تعریف ہے۔

میں نے صبح کو یہ واقعہ حضرت مولانا ضیاء الدین محدث مدنیؒ سے بیان کیا، وہ مجھے اپنے ساتھ والد ماجد کی خدمت میں لے گئے، اور ان سے بیان کیا، انھوں نے اٹھ کر دوگانہ ادا کیا، پھر فرمایا کہ میں نے اس کے حق میں بہت سی بشارتیں بزرگوں سے سنی ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے جو آپ کی توجہ سے ظاہر ہوئی، والحمد للہ علیٰ ذلک۔

(باقی)

وفیات

مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی یاد میں

آہ! ع جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں

از سید صباح الدین عبد الرحمٰن

مولانا سعید احمد اکبر آبادی دنیا کے بکھیڑوں، زندگی کے ہنگاموں اور اپنے علمی جھمیلوں سے آزاد ہو کر اب وہاں ہیں جہاں اکرامِ الٰہی کی سلسبیل سے کوئی سیراب ہو جائے تو پھر اس کے لیے وہاں مغفرت کے مینا اور رحمت کے ساغر چھلکتے رہتے ہیں، بارگاہ ایزدی میں ان کے اعمال کی کتاب کھولی جائے گی تو یقین کرنے کو جی چاہتا ہے کہ عدل خداوندی کی میزان میں ان کی نیکیوں اور نیکوکاریوں کا پلڑا بھاری رہے گا، اس جہانِ فانی میں ان کی رحلت پر علم سوگوار ہوا، فضل غم ناک ہوا اور وہ لمحات بھی مغموم ہوئے جن میں وہ اپنے قلم کی سیاہی سے اپنے داغ دل کو داغ لالہ بنا دیتے تھے، میری طرح ان کے بہت سے قدر دان ان کو اب یاد کر کے اپنے خشک آنسوؤں کے ساتھ بے چین ہوں گے، اور آیندہ ان پر بہت کچھ لکھا جائے گا ع

دریں آشوبِ غم عذرم بنہ گر نالہ زن گریم جہانے راجگر خون شد ہمیں تنہا نہ من گریم

دل کے اس شیون کے ساتھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کی یادوں کا جلوس کہاں سے شروع کر کے

کہاں پر ختم کیا جائے، اپنی کج مج بیانی حائل ہو رہی ہے، پھر بھی جو سطریں یہاں پر لکھی جا رہی ہیں، وہ محض ایک دیرینہ نیازمند اور عقیدت مند کے بارِ غم کو ہلکا کرنے کے لیے ہیں۔

ان کی پیدائش ۱۹۰۸ء میں آگرہ میں ہوئی، ان کا آبائی وطن بچھرایوں ضلع مراد آباد تھا، ان کے والد بزرگوار ڈاکٹر تھے، اپنی سرکاری ملازمت کی وجہ سے ان کا آخری زمانہ آگرہ میں گذرا تو وہیں سکونت پذیر ہو گئے، اور یہیں مولانا سعید احمد کی ولادت ہوئی، اسی مناسبت سے اکبرآبادی لکھتے تھے، ان کے نام کے اس جزو کے ساتھ پرانے اکبرآباد کی بہت سی روایتیں ان کی طبیعت اور روزمرہ زندگی میں پیوست ہو گئی تھیں، اکبرآباد کی تاریخ کی طرح ان کی زندگی میں بھی بڑی رنگا رنگی رہی۔

اپنی ابتدائی تعلیم کے بعد دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے، وہاں سے سند حاصل کر کے دہلی یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم پائی، پھر اسی کے اسٹیفن کالج میں عربی کے استاد مقرر ہوئے، یہاں ان کی مختلف صلاحیتوں کا اندازہ لگایا گیا، تو کلکتہ کے مدرسۂ عالیہ کے پرنسپل مقرر ہوئے، وہاں ان کی شہرت کو اور چار چاند لگے تو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کے صدر کی حیثیت سے بلا لیے گئے، یہاں سے ریٹائر ہوئے تو ہمدرد نگر تغلق آباد نئی دہلی میں ان کی علمی خدمات حاصل کی گئیں، وہیں سے تمری یوتی یونیورسٹی میں وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے بلا لیے گئے، پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اسلامک اسٹڈیز میں بھی کچھ دنوں پروفیسر رہے، آخر میں دارالعلوم دیوبند کی شیخ الہند اکادمی کے ڈائرکٹر تھے، اس اثنا میں ان کا علمی سفر کنیڈا، نیویارک، پرنسٹن، لندن، مصر، سعودی عرب اور جنوبی افریقہ وغیرہ کا بھی ہوتا رہا، پاکستان تو خدا جانے کتنی بار وہاں کی علمی کانفرنسوں میں بلائے گئے، ہندوستان کی کوئی اہم علمی کانفرنس ایسی نہ ہوتی جس میں وہ مدعو نہ ہوتے، پھر اپنے سیاسی ذوق کی وجہ سے آل انڈیا مسلم کنونشن کے صدر بھی منتخب ہوئے، ان کو

جمہوریۂ ہند کے صدر کی طرف سے عربی میں سندِ اعزاز بھی ملا، کلکتہ کی ایک ادبی انجمن کی طرف سے دس ہزار کا انعام بھی پیش کیا گیا۔

وہ جہاں رہے، گل رعنا بن کر رہے، کسی علمی کانفرنس میں شرکت کرتے تو اس کے گل سرسبد بن جاتے، کسی سے ملتے تو گل نیلوفر کی طرح کھلے ہوئے نظر آتے، مجلس میں بیٹھ کر باتیں کرتے تو علم، فضل، شعر اور ادب کا گلدستہ بنے ہوئے دکھائی دیتے۔

اس برصغیر کے بڑے اچھے مقرروں میں شمار کیے جاتے، تقریر کرتے وقت اپنی علمیت، زبان کی فصاحت، طرزِ ادا کی بلاغت اور خطابت کی پوری شان دکھاتے، مگر اس میں الفاظ کی بہتات اور خطابت کا تصنع نہ ہوتا، بلکہ ان کو سنتے وقت ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی اہلِ علم اپنی بصیرت سے اپنے سامعین کے ذہن میں ضیاء پاشی کر رہا ہے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اپنے فنِ خطابت سے وہاں کے اساتذہ اور طلبہ کو برابر متاثر رکھا، وہ اردو، عربی اور انگریزی تینوں زبانوں کے مقرر تھے، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی اس وقت دنیا کے بہترین خطیبوں اور مقرروں میں شمار کیے جاتے ہیں، لیکن مولانا سعید احمد اکبرآبادی جب کبھی دارالعلوم ندوۃ العلماء پہونچ جاتے تو ان کی تقریر کو سننے اور سنانے کے لیے ضرور کوئی مجلس منعقد کراتے، وہ بولتے تو حضرت مولانا کے چہرے سے ظاہر ہوتا کہ وہ ان کی قوتِ گویائی سے متاثر ہو رہے ہیں اور تحسین بھری نظروں سے حاضرین کو بھی دعوت دے رہے ہیں کہ وہ بھی حظ اٹھائیں۔

گذشتہ سال مارچ میں وہ سندھ کے ایک سمینار میں تشریف لے گئے، یہ راقم بھی اس میں مدعو تھا، اس کا افتتاح کراچی میں جنرل ضیاء الحق نے کیا، بڑا اچھا مجمع تھا، پورا ہال اکابر سے بھرا ہوا تھا، مولانا اس مجلس کے مہمانِ خصوصی بنائے گئے، اس میں ان کو سندھ کی علمی اور ثقافتی حیثیت پر کچھ اظہارِ خیال کرنا تھا، جب وہ بولنے لگے تو سارا مجمع متاثر نظر آیا، مختصر بولے مگر بہت ہی پیارے انداز میں

بولے، جنرل ضیاء الحق کے ساتھ ہر شخص کی زبان پر تھا کہ ایسی پیاری تقریر بہت دنوں کے بعد سننے میں آئی،

پاکستان میں ان کی مقبولیت راقم نے اپنی آنکھوں سے دیکھی، ۱۹۸۰ء میں پندرہویں صدی ہجری کے آغاز پر اسلام آباد میں ایک بہت بڑی بین الاقوامی کانفرنس تھی، وہ وہاں بلائے گئے تھے، یہ خاکسار بھی مدعوئین میں تھا، اس کا افتتاح جنرل ضیاء الحق نے کیا، جس کے بعد چائے کا وقفہ ہوا، تو جنرل ضیاء الحق کی نظر مولانا پر پڑی، بہت بے تکلفانہ انداز میں ان سے مخاطب ہو کر بولے حضرت آپ کا ایک شاگرد آپ کے سامنے کھڑا ہے، اس کو اسٹیفن کالج میں آپ کی شاگردی کی سعادت حاصل ہوئی تھی، خود مولانا کو اس وقت کے ضیاء الحق کی صورت یاد نہ تھی، دونوں نے بڑی گرم جوشی سے معانقہ کیا، مجمع اس قران السعدین سے محظوظ ہو رہا تھا، جنرل ضیاء الحق نے رخصت ہوتے وقت ان سے وعدہ لیا کہ وہ ان کے یہاں آکر کچھ دنوں مہمان رہیں گے۔

۱۹۸۴ء کے مارچ میں سندھ کے مذکورۂ بالا سیمینار میں بھی جنرل ضیاء الحق کی نظر مولانا پر پڑی تو بڑی محبت سے ان کو ڈائس پر بلا کر اپنے بغل میں بٹھایا، اور پھر اپنی تقریر میں ان کی تعلیم و تربیت کا بھی ذکر کیا، اس مرتبہ بھی مولانا کو اسلام آباد میں اپنے یہاں مدعو کیا۔

پاکستان میں ان کے ساتھ ایک دلچسپ لیکن عجیب و غریب علمی سفر کی یاد بھی اس وقت بے اختیار آرہی ہے، ۱۹۷۶ء میں وہاں کی پہلی بین الاقوامی سیرت کانفرنس میں ہم دونوں مدعو تھے، جب اس کی ایک نشست کراچی میں ہوئی تو حیدرآباد سندھ سے کچھ لوگ مولانا قاری محمد طیب مرحوم سابق مہتمم دار العلوم دیوبند کو اپنے یہاں کے سیرت کے جلسہ میں مدعو کرنے آئے تو مولانا سعید احمد اکبرآبادی کو بھی دعوت دی، پھر مجھ سے بھی شرکت کرنے کو کہا گیا، میں تو جانے کے لیے تیار نہیں ہوا، کیونکہ سیرت کی کانفرنس میں مقالے تو پڑھ لیتا ہوں، مگر کوئی لمبی تقریر کرنے کا عادی نہیں ہوں، وہاں جانے سے انکار کیا، لیکن مولانا نے یہ کہہ کر چلنے پر مجبور کیا کہ مولانا قاری محمد طیبؒ کا وعظ اتنا لمبا

ہو جائے گا کہ ہم لوگوں کے بولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا، ان کی اس ضمانت پر چلنے کو تیار ہو گیا، دوسرے دن موٹر سے ہم لوگوں کو لے کر مولانا قاری محمد طیبؒ کی قیام گاہ پر پہونچی تو انھوں نے جانے سے معذرت کی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی پریشان ہوئے، اور میری سراسیمگی کی تو کوئی حد نہ تھی، ہم لوگ واپس بھی نہیں ہو سکتے تھے، پریشانی میں جلسہ گاہ پہونچے تو ہزاروں کا مجمع دیکھا جو مولانا طیبؒ کو سننے کے لیے بے چین تھا، نعرۂ تکبیر کی بار بار صدا بلند ہو رہی تھی، ہم لوگوں کے پہونچتے ہی جلسہ شروع کر دیا گیا، مولانا مائک پر بلائے گئے، موٹر کے لمبے سفر سے ہم لوگ بالکل تھکے ہوئے تھے، مولانا پر بھی تکان کا اثر تھا، وہ بولنے کے لیے تیار ہو کر بھی نہیں آئے تھے، انھوں نے مجبوراً تقریر شروع کر دی، لیکن یہ جم نہیں رہی تھی، میں پریشان تھا کہ اتنے بڑے مجمع میں میرا تو بولنا اور بھی مشکل ہوگا، یکایک ایک صاحب میرے پاس آئے، وہ میری کتاب بزم صوفیہ پڑھ چکے تھے، میرے کان میں کہنے لگے کہ صوفیائے کرام کے واقعات سے مجمع کا رنگ بدل جائے گا، کیونکہ یہاں کے لوگ ان کے واقعات بہت شوق سے سنتے ہیں، جب مائک پر پہونچا تو ان بزرگان دین کی باتیں یاد آتی گئیں، دو چار واقعات سنائے ہوں گے کہ تکبیر کے نعرے بلند ہونے لگے، میرا حوصلہ بڑھا اور مجمع کے ذوق کے مطابق ان بزرگوں کے واقعات دیر تک سناتا رہا، تائید ایزدی بھی ساتھ دیتی رہی، جب بدل کر مولانا کے پاس بیٹھا تو انھوں نے یہ کہہ کر گلے لگا لیا کہ ہندوستان کی اچھی نمائندگی ہو گئی، مگر میں نے عرض کیا کہ آپ نے تو یہاں لا کر تختۂ دار پر چڑھا دیا تھا، خیریت ہوئی کہ اس پر سے صحیح سالم اتر آیا،

وہ ایک بہت ممتاز اہل قلم کی حیثیت سے بھی مشہور ہوئے، ان کی زبانی بارہا سنا کہ وہ شروع سے مولانا شبلیؒ اور دار المصنفین کی تصانیف سے متاثر رہے، دیوبند کی طالب علمی کے زمانے میں ان کے پاس ان کتابوں کو دیکھ کر وہاں کے طلبہ اور اساتذہ کو تعجب ہوتا تھا، اور یہ

کہنے میں تامل نہیں کہ ان کی ذات اور ان کی تحریروں پر دبستان شبلی کا بڑا اثر رہا، جس کا ایک کھلا ہوا ثبوت یہ بھی ہے کہ جب دہلی میں مولانا حفظ الرحمٰن اور مولانا مفتی عتیق الرحمٰن نے مل کر ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا اور اس کی تاسیس میں ان کی بھی شرکت ہوئی تو دارالمصنفین ہی کی تقلید میں اس کا نام ندوۃ المصنفین رکھا گیا اور پھر ان کی ادارت میں رسالہ 'برہان' ندوۃ المصنفین سے نکلنا شروع ہوا تو اس میں معارف ہی کی طرح خاص خاص عنوانات رکھے گئے، ان کا بس چلتا تو ندوۃ المصنفین کو دارالمصنفین ہی کی طرح ایک علمی ادارہ بنا دیتے مگر بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر یہ اشاعتی ادارہ بن کر رہ گیا، پھر بھی اس کی طرف سے اب تک جتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں ان سے اردو زبان کے مذہبی اور تاریخی لٹریچر میں بڑا قابل قدر اضافہ ہوا ہے، مولانا کا رسالہ 'برہان' اس کے لیے اس حیثیت سے مفید رہا کہ اس کی وجہ سے یہ علمی ادارہ ہی سمجھا جاتا رہا۔

مولانا نے اس رسالہ کی ادارت کے فرائض جس شان سے انجام دیئے' وہ اردو زبان کی تاریخ میں جلی حروف سے لکھے جائیں گے، ان کا کوئی معاون نہیں رہا، وہ خود ہی اس کے مضامین کے حک و اصلاح اور ترتیب میں لگے رہتے، اس کے لیے لمبے لمبے مضامین بھی لکھتے، اس میں ریویو کے لیے جو کتابیں آتیں' ان پر ریویو بھی قلمبند کرتے۔ البتہ اس کی کتابت اور طباعت کی ذمہ داری مولانا مفتی عتیق الرحمٰن پر ہوتی، ورنہ سینتالیس ۴۷ سال کی طویل مدت تک ادارت کا سارا کام تنہا ان ہی کے ذریعہ سے انجام پاتا رہا، کسی مہینہ اس کی اشاعت نہیں رکی، جو ان کا زبردست علمی کارنامہ ہے، اس میں 'نظرات' کے عنوان سے ان کی ادارتی تحریریں ہوتیں جن میں ملک کے ہر قسم کے مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کر کے اپنے قلم اور علم کا جوہر دکھاتے رہے' اس کی طرف پورے علمی حلقہ کی نظر اٹھتی رہی، بعض اوقات اپنی رائے کا اظہار بڑی جرأت اور بے باکی سے کرتے، نظری حیثیت سے وہ نیشنلسٹ مسلمان تھے، لیکن حق بات میں ان کی نیشنلزم ان کے قلم پر روک نہیں لگاتی، نظرات میں کبھی وہ اپنے

مذہبی خیالات کے مروارید بکھیرتے، کبھی اپنے جذبات کے تلاطم سے اپنی تحریر کو پُرشور کر دیتے، کبھی علمی نکتہ آفرینیوں سے اپنے ناظرین کو محظوظ کرتے، کبھی مشاہیر کی وفات پر اپنے غمناک تاثرات کا اظہار کر کے دوسروں کو بھی اپنا شریکِ غم بنا لیتے، کبھی اس میں ادب و انشا کا سحر دکھا کر اپنی تحریر سے مسحور کرتے، اگر ان کے نظرات کتابی صورت میں مرتب کیے جائیں تو یہ بہت سی جلدوں میں منتقل ہو کر نظر، فکر، روشن ضمیری، خود اعتمادی اور تبحر علمی کے قیمتی راس المال ثابت ہوں گے۔

وہ بہت سی کتابوں کے مصنف بھی ہوئے، جن میں کچھ یہ ہیں: فہم قرآن، غلامانِ اسلام، وحی الٰہی، صدیق اکبر، مسلمانوں کا عروج و زوال، چار مقالات، تفقہ المصدور اور ہندوستان کی شرعی حیثیت، مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے ناقد، حضرت عثمان غنی ذی النورین رضؓ اور خطبات اقبال پر ایک نظر، ان کی تمام تصانیف پر ایک مستقل کتاب لکھ کر ان کے تصنیفی اور علمی کارناموں کو خراج عقیدت پیش کرنے کی ضرورت ہے، یہاں پر ہم ان کی دو تصانیف وحی الٰہی اور صدیق اکبر کی کچھ جھلکیاں دکھانے پر اکتفا کریں گے، وحی الٰہی میں وحی کی ضرورت، وحی کی مختلف صورتیں، قرآن اور وحی، خدا کی صفات، وحی اور محققین یورپ، تسلسلِ وحی اور نزول جبرئیل، قرآن مجید وحی الٰہی کیوں ہے؟ قرآن مجید کا اسلوب بیان اور بعض عیسائی مصنفین پر ان کے جو مباحث ہیں' ان کو پڑھ کر ان کی علمی فضیلت اور جلالت کا بڑا اثر پڑتا ہے، جس ایمانی حرارت اور مذہبی راسخ العقیدگی سے یہ لکھی گئی ہے اس کے بعض مباحث بارگاہ ایزدی میں بھی ضرور مقبول ہوئے ہوں گے، اس کی وجہ تصنیف جس دلچسپ انداز میں بتائی گئی ہے اس کو پڑھ کر اس کتاب کی نوعیت کا نہ صرف اندازہ ہوگا، بلکہ ناظرین کے ایمان میں نور اور ذہن میں سرور پیدا ہو کر ان کے بہت سے شکوک و شبہات کافور ہو جائیں گے، لکھتے ہیں:

"دنیا میں سیکڑوں سوالات ہیں جن کے جواب میں انسان سب کچھ کہنے کے بعد آخر میں ایک ایسے

مرحلے پر پہونچا ہے کہ پھر اس کے لیے جواب کی کوئی گنجائش نہیں رہتی، ہاتھی اس قدر فربہ اور توانا کیوں ہے؟ چیونٹی کیوں اتنی نحیف وزار ہے، آم کے درخت پر آم ہی کیوں لگتے ہیں، جامنیں کیوں نہیں پیدا ہوتیں؟ غم سے رونا اور خوشی سے ہنسنا ہی کیوں آتا ہے؟ اس کے برعکس کیوں نہیں ہوتا؟ یہ اور اس کی طرح سیکڑوں سوالات ہیں، جن کے جواب کا آخری رتبہ یہ ہے کہ ان تمام اشیاء کے طبعی خواص اور ان کی نوعی مختصات پر محول کر دیا جائے، پھر اگر اس کے بعد بھی یہ سوال کیا جائے کہ اس شے کی یہ طبعی خاصیت کیوں ہے؟ اور یہی کیوں ہے؟ اور یہ چیز کیوں نہیں، تو اس کے جواب میں ایک ملحد کہے گا کہ مادہ کی ترکیب اسی طرح ہوئی ہے، لیکن موحد جواب دے گا کہ خدا نے ہر شے کی صورت نوعیہ میں ایک الگ خاصیت رکھی ہے، جواب دونوں کے مختلف ہوں گے، لیکن ہر ایک کا یہ جواب ایک آخری جواب ہوگا کہ اگر اس کے بعد میں سائل کیوں سے سوال کرے تو اس کے جواب میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

وحی کا مسئلہ اسی طرح کے مسائل میں سے ہے، اس کی حقیقت کے سمجھانے میں ہم بتا سکتے ہیں کہ خدا کلام کرتا ہے، خاص خاص انسان (انبیاء) اس کا کلام سنتے اور سمجھتے ہیں، اور ہم یہ بھی کر سکتے ہیں کہ ان دعووں پر جو عقلی اعتراضات کیے جائیں ان کو رفع کر دیں، لیکن اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص "ایسا ہی کیوں ہوتا ہے"، کہہ کر ہم سے سوال کرے گا تو اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ اچھا پہلے تو ہمارے ہزاروں کیوں کا جواب دے دو، پھر ہم بھی تمھیں سمجھا دیں گے کہ خدا انبیاء میں ہی کیوں کلام ربانی کو سمجھنے کی استعداد رکھتا ہے؟ ہم تم میں کیوں یہ صلاحیت نہیں ہوتی؟ زیر نظر کتاب میں وحی الٰہی پر جو بحث کی گئی ہے اس کا مقصد ان ہی سوالات کا جواب دینا ہے جو واقعی ایک طالب تحقیق کے دل میں اس مسئلہ پر غور کرنے کی راہ میں پیدا ہو سکتے ہیں، ان کے علاوہ جو لوگ از راہ بغض و عناد اپنے کیوں کا سلسلہ کہیں ختم نہیں کرتے وہ اس کے مخاطب نہیں۔

مولانا کی اس پرکیف تحریر کو پڑھنے کے بعد اس کے ناظرین کے بہت سے مذہبی خیالات میں جلا

پیدا ہو سکتی ہے۔

ان کی کتاب صدیق اکبرؓ بہت مقبول ہوئی، انھوں نے اس کے دیباچہ میں اس کے ماخذوں پر جو بحث کی ہے اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا کہ اس کی تدوین کرنے میں کیسی محنت شاقہ کی گئی ہے، پھر جس دلنشین پیرایہ میں یہ شروع سے آخر تک لکھی گئی ہے، وہ اس کی اصلی خوبی ہے، اس میں ان کے ابر قلم کے جو رشحات ہیں ان کے دو چار نمونے یہاں پر پیش کرنے کو جی چاہتا ہے، تاکہ ناظرین میری طرح تھوڑی دیر کے لیے ان کے اسلوب اور طرز بیان سے بھی لطف اٹھائیں، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی سیرت پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"تاریخ کا ایک طالب علم کہہ سکتا ہے کہ دنیا میں سکندر اعظم، ہنی بال، چنگیز خان، تیمور اور بھی بڑے بڑے فاتح گذرے ہیں، جنھوں نے نہایت عظیم الشان فوجی کارنامے انجام دیے، لیکن سوال یہ ہے کہ دنیا میں کوئی عظیم الشان فاتح ایسا بھی گذرا ہے جس نے دنیا کی تاریخ کا ورق الٹ دیا، لیکن اس کے باوجود اس کے سر پر تاج زرفشاں ہو اور نہ اورنگ سلطانی ہو، معمولی سے معمولی آدمیوں کی طرح رہتا سہتا ہو، اس میں اور دوسرے لوگوں میں شان و شوکت اور وجاہت و سطوت کے اعتبار سے کوئی فرق نہ ہو، وہ محلہ کی بکریوں کا دودھ بھی دوہ دیتا ہو، رات کے وقت چھپ چھپ کر نابینا عورت کے گھر کا سارا کام بھی کر آتا ہو، معمولی کپڑے پہنتا ہو، موٹا جھوٹا کھاتا ہو، اس کے پاس نہ خدم و حشم ہوں اور نہ محلات و قصور، نہ خزانے ہوں، اور نہ زر و سیم کے انبار، نہ چوکیدار، نہ دربان، نہ ملٹری گارڈ اور نہ پولیس کا حفاظتی دستہ، ایک معمولی سے معمولی انسان بھی برملا اس کو سر راہ ٹوک سکتا ہو، ایک ادنیٰ حیثیت کا شخص بھی بھرے مجمع میں اس سے باز پرس کر سکتا ہو۔"

کیسی موثر اور بادہ تاثیر تحریر ہے، اس کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جب وہ اپنی فوج کو کسی مہم پر روانہ کرنے کے لیے دور تک مشایعت کے لیے جاتے تو اسی

شان ہے کہ وہ خود پاپیادہ ہوتے اور اس کا نوعمر و نوجوان امیر فوج گھوڑے پر سوار ہوتا، اس کی بیٹی اپنے شوہر کے گھوڑوں کا دلیہ خود دلتی ہو اور پھر نو نو میل اسے سر پر رکھ کر پیدل چلتی ہو، اور خود اس کا اپنا حال یہ ہو کہ وہ کپڑوں کا گٹھر اپنے سر پر رکھ کر بازار میں پھرتا ہو، بتاؤ فوجی وحربی کامگاری کے ساتھ جمہوریت اور یہ مساوات و برابری، یہ تواضع و فروتنی پوری تاریخ عالم میں کہیں اور بھی نظر آتی ہے؟ اس میں شبہہ نہیں کہ جمہوریت اور مساوات کی جو مثال حضرت عمرؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں قائم کی وہ اپنی جگہ بے نظیر ہے، لیکن حضرت ابوبکرؓ کی اس بے نفسی اور انتہائی سادگی کو دیکھ کر حضرت عمرؓ بھی کہہ پڑے: اے ابوبکر! تم نے اپنے بعد میں آنے والوں کے لیے بڑی مشکلات پیدا کر دیں، یعنی تمہارے نقش قدم پر چلنا کسی کے بس کی بات نہیں۔"

حضرت ابوبکرؓ کی سیرت کو نمایاں کرنے کے لیے جس دلنواز طرز ادا کی ضرورت تھی اس کو مولانا نے اپنی تحریر کے ذریعہ سے فراہم کیا، پھر ان کو یہ سب کچھ لکھنے میں ایسی لذت ملی کہ ان کا قلم روکے نہیں رُکا، بے ساختہ طور پر ان کے قلم سے یہ تحریر بھی نکل پڑتی ہے:

"پھر فاتحین و کشورکشایان عالم میں کتنے ہیں جن کے لشکروں نے شہروں کو نہ اجاڑا ہو، آبادیوں کو ویرانہ میں تبدیل نہ کر دیا ہو، بوڑھوں، بچوں اور عورتوں پر ترس کھایا ہو، کھیتوں کو آگ نہ لگائی ہو، درختوں کو نہ کاٹا ہو، لیکن یہاں کیا عالم تھا، فوج روانہ ہوتی تھی تو بڑی تاکید سے ان امور کی نسبت ہدایات دی جاتی تھیں اور کسی کی مجال نہ تھی کہ فرمان خلافت سے ذرا سرتابی کر سکے، ان سب چیزوں کا اثر یہ تھا کہ جو لوگ میدان جنگ میں شمشیر آزما بن کر آتے تھے، جب ہوا کا رخ پلٹتا تھا تو ان ہی کی زبانیں فاتحین کے لیے دعائیں کرتی تھیں، جنگ کے ختم ہونے کے بعد جنگ کی ہولناکیوں کا نام و نشان جنگ سے باہر نہیں نظر آتا تھا، اور ملک میں پہلے سے زیادہ خوشحالی اور آسودگی پیدا ہو جاتی تھی۔"

جو باتیں اوپر لکھی گئی ہیں وہ کچھ ایسی نئی نہ تھیں جو پہلے کبھی نہ لکھی گئی تھیں، لیکن مولانا نے ان کو اپنے قلم کی جس گرمی سے لکھا ہے وہی اس تحریر کی جان ہے، ان کو حضرت ابوبکرؓ سے جو والہانہ عقیدت تھی، اس کو والہانہ انداز ہی میں اپنی تحریر میں منتقل کر دیا ہے، اور جب وہ یہ لکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ لکھ نہیں رہے ہیں بلکہ بول رہے ہیں اور کانوں میں امرت گھول رہے ہیں:

"جو کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تکمیل کو نہ پہونچا تھا، خلیفۂ اول کے ہاتھوں اس کی تکمیل ہوئی، پوری عرب قوم کو متحد کرنے کے علاوہ قرآن مجید کو جمع کرنا اور اس کو ضیاع سے بچا لینا بے شبہہ ایک پیغمبرانہ کارنامہ ہے جس کی وجہ سے خود اللہ تعالیٰ کا وعدہ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ پورا ہوا، قرآن جس پر اسلامی شریعت کی اساس قائم ہے، اس کو جمع کر کے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دینا، زکوٰۃ وصدقات کے احکام کی تبلیغ واشاعت اور ان کی تفصیل و تشریح، جیش اسامہ کی روانگی، مرتد اور باغیوں کی سرکوبی، مدعیان نبوت کا استیصال، ایران اور روم کی ان کے اسلام دشمن منصوبوں کی بنا پر گوشمالی، اسلام کی تبلیغ واشاعت، قبائل عرب کا باہمی اتحاد واتفاق، اسلام کا عربوں کے لیے قومی مذہب بن جانا، یہ سارے اہم کام جو کل سوا دو برس کی مدت میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھوں انجام پذیر ہوئے ان سب کو سامنے رکھو اور بتاؤ کہ کیا ان سے صاف طور پر ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت ابوبکرؓ پیغمبر نہیں تھے اور نہ ہو سکتے تھے، لیکن ان کے یہ تمام کارنامے پیغمبرانہ تھے، چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ نے ایک مرتبہ فرمایا: اگر ابوبکرؓ نہ ہوتے تو خدا کی عبادت نہ کی جاتی، گویا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ کہہ کر پیغمبر آخر الزماںؐ کے ساتھ جس کی جسمانی معیت ورفاقت پر مہر تصدیق ثبت کی تھی، ازل میں اس کے لیے یہ سعادت بھی مقدر کر دی گئی تھی کہ جسمانی رفاقت کے ساتھ معنوی اشتراک عمل اور باطنی رفاقت کا بھی اس سے مظاہرہ ہو۔" (صدیق اکبرؓ، شائع کردہ ندوۃ المصنفین، دہلی ص ۴۸۰ - ۴۷۴)

اس ایک پیراگراف میں حضرت ابوبکرؓ کے سارے کارنامے سامنے آجاتے ہیں، مولانا نے جس بے ساختگی کے ساتھ ان کو قلمبند کیا ہے اس کی داد ان کو کیسے نہیں مل سکتی ہے، ان ہی ساری باتوں کا اطناب اس کتاب میں ملے گا، اردو میں حضرت ابوبکرؓ پر اتنی مفصل اور سیر حاصل کتاب پہلی دفعہ لوگوں کے ہاتھوں میں آئی جس میں اس دور کے اہم دینی، سیاسی، فقہی اور تاریخی واقعات اور کوائف پر بڑی جامعیت کے ساتھ مفید مباحث بھی ہیں۔

ان کی یہ کتاب ان کے دستار علم کی ایک بہت ہی تابدار اور زریں کلغی ہے۔

مولانا سے جو عقیدت رہی اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ ان کی تمام کتابوں پر کچھ نہ کچھ لکھ کر لطف اٹھاتا، مگر زیر نظر تحریر تو محض تعزیتی اور تاثراتی ہے، اس لیے اس میں اس کی گنجائش نہیں، اوپر کی کچھ باتیں غیر ارادی طور پر قلم سے نکل پڑی ہیں، ان کے عام طرز تحریر کا جب تجزیہ کیا جائے گا تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس میں جہاں ادب و انشا کا جمال ہے، وہاں ان کے اسلوب میں عالمانہ وقار، منطقیانہ وزن اور ماہرانہ استدلال کی متانت بھی ہے، وہ عالم بھی تھے، انگریزی تعلیم یافتہ بھی تھے، اس لیے قدیم و جدید رنگ کی آمیزش سے ان کا قلم بعض اوقات اس مصور کا موئے قلم ہو جاتا جو مختلف رنگوں کے حسین امتزاج سے اپنے آرٹ کو دیدہ زیب اور جاذب نظر بنا دیتا ہے، ان کو قرآن مجید، احادیث اور فقہ کا ادراک و فہم حاصل تھا، اکابر اسلام سے بے پناہ عقیدت تھی، مسلمانوں کے ماضی کی عظمت کا احساس تھا، اس لیے ان کے قلم میں ایمانی حرارت بھی ہوتی، تب وتاب زندگی بھی، دعوت اصلاح بھی، درس عمل بھی، سلف صالحین کی قدروں کا احترام بھی، اور موجودہ دور کی حریت فکر بھی، روشن ضمیری بھی، اور تھمے ہوئے جذبات کی لہریں بھی، ان اجزائے ترکیبی سے ان کی تحریریں جہاں کہیں بھی چھپی ہوئی دکھائی دیتیں ممکن نہ تھا کہ وہ پڑھی نہ جاتیں، اس طرح ان میں مقناطیسیت بھی تھی۔

راقم سے ان کے ملنے ملانے کی روداد بڑی طویل ہے، پہلی بار ان سے دہلی میں مولانا مفتی عتیق الرحمن کے یہاں ملاقات ہوئی، کلکتہ میں جب وہ مدرسہ عالیہ کے پرنسپل ہوئے تو اس بنگلہ میں بھی حاضری دی جہاں ان سے پہلے بہت سے انگریز پرنسپل رہ چکے تھے، وہ علی گڑھ آئے تو جب جب وہاں گیا ان کے در دولت پر یا ان کے شعبہ میں جا کر ان سے ضرور ملا، ۱۹۶۵ء میں وہ دارالمصنفین کی طلائی جوبلی کے موقع پر اعظم گڈھ تشریف لائے، ۱۹۶۹ء میں یہاں علی گڑھ کے اسلامک اسٹڈیز کی ایک کانفرنس ہوئی، تو اس میں بھی شرکت کی، ۱۹۸۲ء میں اسلام اور مستشرقین پر یہاں جو سیمینار ہوا، تو اس موقع پر بھی آکر اس کی رونق بڑھائی، ایک بار اعظم گڈھ کے قصبہ بلریا گنج کے مدرسہ کے طلبائے قدیم کو مخاطب کرنے گئے، تو یہاں بھی تشریف لا کر ہم لوگوں کی عزت افزائی کی، وہ کہتے کہ اور لوگ تو دارالمصنفین پاؤں کے بل آتے ہیں، مگر وہ یہاں اپنی پلکوں کے بل آتے ہیں، اس برصغیر کی علمی کانفرنسوں میں تو برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں، دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے سالانہ جلسہ میں یا اس کی کسی اور تقریب میں لکھنؤ آتے تو یہ راقم بھی موجود ہوتا، ہم دونوں جب اور جہاں ملتے تو وہ دیکھتے ہی ایسی تواضع کرتے جو قند سے زیادہ شیریں ہوتی، شاداں و فرحاں ہو کر گفتگو شروع کر دیتے، تو معلوم ہوتا کہ ان کی بذلہ سنجیوں کی مے ارغوانی

چھلک رہی ہے، اچھل رہی ہے، پیے ہوئے ہیں، پلا رہے ہیں

معارف کے کسی مضمون یا شذرات کا ذکر خیر کرنے لگتے تو کہتے کہ تم اپنی نثر میں شاعری کرتے ہو، میں عرض کرتا کہ کاش میں آپ کی طرح ملک الشعرائی کرتا، کبھی کہتے کہ تم جیسے جیسے بوڑھے ہو رہے ہو تمہاری تحریر جوان ہوتی جارہی ہے، میں جواب دیتا کہ لکھتے وقت آپ کی عمر رفتہ کو آواز دیتا رہتا ہوں، کبھی کہتے کہ میری نواسیاں تمہاری تحریر کو میری تحریر سے زیادہ پسند کرتی ہیں، میں کہتا اس لیے کہ آپ نے اپنے پر تکلف دسترخوان پر ان کو اپنے یہاں کے مرغ مسلم کو دال برابر سمجھنے کی تربیت دی ہے،

پھر کہتے کہ کیا یہ تصور کرنا صحیح نہیں کہ ہم دونوں کو علم کے دربار عام میں بقائے دوام حاصل ہوگی، میں عرض کرتا کہ اس میں تو آپ کے لیے آپ کی ولادت باسعادت سے پہلے ہی جگہ متعین کر دی گئی ہے، میری زندگی میں بہت سی محرومیاں رہی ہیں، یہ محرومی بھی پہلے سے مقدر ہو چکی ہے، وہ اپنی اس قسم کی باتوں کو میری تصانیف پر رسالہ برہان میں تبصرہ کرتے وقت لکھ بھی جاتے۔

اب وہ نہیں ہیں تو ان کی تمام باتوں کو اپنی یادوں کے شیش محل میں فانوس فروزاں کی طرح برابر جگمگاتا ہوا دیکھتا رہوں گا۔

ان کو استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ سے بڑی گہری عقیدت رہی، وہ جب دار العلوم دیوبند میں تعلیم پا رہے تھے تو ان کی خواہش تھی کہ دو تین سال انکے زیر تربیت رہ کر اپنے تصنیف و تالیف کے ذوق کی تکمیل کریں، لیکن یہ ممکن نہ ہو سکا تو مراسلت کے ذریعہ سے استفادہ کرتے رہے، ایک بار اپنی ایک نظم معارف میں چھپنے کے لیے ان کے پاس بھیجی تو انھوں نے اس کو واپس کرتے ہوئے یہ تحریر فرمایا کہ آپ اس نظم نویسی کے چکر میں کہاں پڑ گئے، آپ کے رتبہ سے گری ہوئی چیز ہے، کچھ محنت کیجیے، اور مقالہ نویسی پر توجہ کیجیے، قوم کو آپ سے اسی کی توقع ہو سکتی ہے، اور یہی ہونی چاہیے، اس تحریر کا اثر ان کے ذہن پر گہرا پڑا، اور انھوں نے اس کے جواب میں یہ شعر لکھ بھیجا ؎

کون ہوں، کیا ہوں کہاں ہوں سب حقیقت کھل گئی　　تو نے وہ ٹھوکر لگائی چشمِ علت کھل گئی

وہ حضرت سید صاحبؒ کے اعلیٰ رتبہ اور بلند پایہ کے بڑے قائل تھے، اور جب ان کی وفات کے بعد معارف کا سلیمان نمبر نکلا تو اس کے لیے بڑی دلسوزی کے ساتھ ایک بہت ہی عمدہ مضمون لکھا جس کی ابتداء انھوں نے اس طرح کی ہے:

"مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت یہ کہنا کہ وہ ایک بہت بڑے محقق، نامور مصنف، بلند پایہ عالم اور صاحبِ طرز انشاپرداز تھے، ایک عام اور معمولی پیرایۂ بیان ہے جس سے مولانا کا

اصل مقام اور رتبہ متعین نہیں ہوتا، اور نہ ان کا صحیح حق ادا ہوتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی میں ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی کے ذہن و فکر اور یہاں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں خواہ وہ طرز قدیم کا ہو یا طرز جدید کا، نصف صدی کے اندر مذاق تصنیف و تالیف، طریق فکر و استدلال اور تہذیبی امیال و عوامل کے اعتبار سے جو عظیم الشان انقلاب ہوا ہے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اور ان کے علمی و عملی کارناموں کو اس میں بڑا دخل ہے۔"

مولانا کی اس تحریر کی روشنی میں حضرت سید صاحبؒ پر بڑا کام کیا جا سکتا ہے، ان کو دار المصنفین سے جو لگاؤ رہا اس کا اظہار اپنی ایک تحریر میں اس طرح کیا ہے:

"دار المصنفین اعظم گڈھ، برصغیر انڈو پاک کا ایک مشہور اور نہایت وقیع ادارہ ہے، جو گذشتہ نصف صدی سے اردو زبان میں اسلامی علوم و فنون کی اہم خدمات انجام دے رہا ہے، اس ادارہ نے سیرت، اسلامی تاریخ، شعر و ادب، فلسفہ و تصوف اور تذکرہ و تراجم پر جو کتابیں شایع کی ہیں، وہ مواد، ترتیب اور زبان و معانی کے لحاظ سے کسی بھی زبان کے ادب کے لیے سرمایۂ فخر بن سکتی ہیں، آج ہند و پاک میں اسلامی علوم و فنون پر ریسرچ اور تحقیق کا جو سنجیدہ ذوق پایا جاتا ہے، کوئی شبہ نہیں کہ اس کی آبیاری میں اور چیزوں کے ساتھ اس ادارہ کی کوششوں کا بھی بڑا دخل ہے، اس ادارہ نے خود کام کیا اور دوسروں کو کام کرنے کی راہ دکھائی اور اس کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ آج اردو زبان میں اسلامیات پر ایسا قیمتی اور وسیع لٹریچر پیدا ہو گیا ہے کہ آپ کسی اسلامی موضوع پر ریسرچ اردو زبان کے جانے بغیر مکمل ہی نہیں ہو سکتی۔" (برہان، اکتوبر ۱۹۶۴ء)

پھر اس گہرے لگاؤ کی وجہ سے اس کے ہر فرد سے بڑی محبت کرتے تھے، جناب شاہ معین الدین احمد ندوی سابق ناظم دار المصنفین کی وفات ہوئی تو بہت ہی دلگیر ہو کر لکھا:

"ان کی وفات کی خبر اچانک سنی تو قلب و دماغ پر بجلی گر پڑی، شاہ صاحب ندوۃ العلماء کے

گل سرسبد، نہایت پختہ قلم مصنف، تاریخ اسلام کے وسیع النظر محقق، اردو زبان کے ادیب، اور سو باتوں کی ایک بات یہ کہ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے صحیح جانشین اور ان کے قائم مقام تھے، اور اس میں شک نہیں کہ تقسیم ہند کے بعد سے اب تک انھوں نے دارالمصنفین کے علمی وقار اور مرتبہ کو قائم رکھا، اور ملک کے نہایت سخت طوفانی دور میں بھی اس باغیچۂ علم و ادب کی جس طرح حفاظت کی اور دل و جان سے اس کی آبیاری کی وہ ان کی قبائے فضل و کمال کا تکمۂ زریں ہے، علم و فضل اور تحقیق و تصنیف کے علاوہ اخلاق و عادات اور کردار و عمل کے اعتبار سے بھی وہ سلف صالحین کا نمونہ تھے، نہایت مخلص، بے لوث، عابد، زاہد، خندہ جبین، شگفتہ طبع، ملنسار، متواضع اور مرنجاں مرنج تھے۔" (برہان، جنوری ۱۹۷۵ء)

ان کے دل میں حضرت سید صاحبؒ، دارالمصنفین، اور یہاں کے لوگوں کے لیے جو انتہائی نرم گوشہ تھا اس کے بعد ان کی ذات گرامی کی طرف کیوں نہ کشش ہوتی، وہ محبوب بھی تھے اور حبیب بھی، دلبر بھی اور دلربا بھی ؏

تصور چاہیے رونے میں اس کے روئے خنداں کا

جب میری کوئی کتاب شائع ہوتی تو اس کو اصرار کر کے ضرور منگواتے اور رسالۂ برہان میں اس پر تبصرہ کرتے، میری حقیر تصانیف بزم تیموریہ، بزم صوفیہ، ہندوستان کے عہد وسطیٰ میں فوجی نظام، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، غالب مدح و قدح کی روشنی میں، اور صوفی امیر خسرو پر اس رسالہ میں جو کچھ لکھ دیا ہے اس سے ان کے وزن اور اہمیت میں ضرور اضافہ ہو گیا ہے لیکن بعض اوقات ایسی باتیں لکھ جاتے جن کا مستحق اپنے کو نہ سمجھتا، مثلاً میری کتاب ہندوستان کے عہد وسطیٰ کے فوجی نظام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ :

"اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اردو تو اردو کسی زبان میں بھی اس خاص موضوع پر اس قدر عظیم مواد اور نہ بھی اس ترتیب کے ساتھ کہیں یکجا نہ ملے گا، مولانا سید سلیمان ندویؒ کی کتاب عرب و ہند کے تعلقات کے بعد اس پایہ کی دوسری کتاب ہے، جو تاریخ ہند کے ایک بالکل نئے موضوع پر اردو میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی ہے اور جس نے اردو لٹریچر کو چار چاند لگا دیے ہیں۔" (رسالۂ برہان، دسمبر ۱۹۶۳ء ص ۳۸۵)

اس کو پڑھ کر اس حیثیت سے انقباضی کیفیت پیدا ہوئی کہ میری اس کتاب کا ذکر حضرت الاستاذؒ کی بے مثال تصنیف کے ساتھ نہ کیا جاتا، اس کے بعد مولانا سے فوراً ہی ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے احتجاجاً کہا کہ خاک کو عالم پاک سے کیا نسبت جو آپ نے یہ لکھ دیا ہے، کہنے لگے کہ ان پر جو اثر ہوا وہ لکھ دیا ہے، لیکن اپنے متعلق ان کی ایسی تحریروں سے کوئی غلط فہمی یا خوش فہمی کبھی پیدا نہیں ہوئی، البتہ ان کی کریم النفسی اور قلمی فیاضی کے بارے دبا رہا۔

نومبر ۱۹۷۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی طرف سے حضرت سید صاحبؒ پر ایک سیمنار تھا، جس نشست میں مجھ کو اپنا مقالہ پڑھنا تھا اس کی صدارت مولانا ہی نے کی، اپنی صدارتی تقریر میں میرے مقالہ پر اپنی محبت میں بہت کچھ کہہ رہے تھے کہ یکایک رک گئے، پھر ہنسے اور ہنس کر اپنی تقریر کا رخ دوسری طرف موڑ دیا، جیسے کوئی خاص بات ان کی نوک زبان پر آ گئی تھی، وہ کہنا چاہتے تھے لیکن کہہ نہ سکے، جلسہ ختم ہوا تو تنہائی میں مجھ سے کہا کہ تمہارے متعلق ایک دلچسپ جملہ زبان پر آ گیا تھا لیکن کہنا مناسب نہیں سمجھا، پوچھا وہ کون سا جملہ تھا؟ برملا کہہ دیا، وہ بھی ہنسے، مجھ کو بھی ہنسی آ گئی، لیکن میں نے اپنی بے تکلفی میں ان سے عرض کیا کہ وہ یہ کہہ دیتے تو میں اسی وقت صدارت کی کرسی کے پاس پہونچ کر گریبان گیر ہونے کی جرأت تو نہ کرتا لیکن دامن گیر ضرور ہو جاتا۔

اس کے دوسرے دن اپنے گھر پر مدعو کیا، علی گڑھ میں ایک بہت ہی آرام دہ بنگلہ بنا لیا تھا، جس کو اپنی خوش سلیقگی سے سجائے رکھتے تھے، وہ بڑی اچھی رہائش کے عادی رہے، اپنے خورد و نوش کا بھی بڑا اہتمام کرتے، کھانے پر مدعو کرتے تو ان کے دسترخوان کی آرائش دیکھنے کے لائق ہوتی، ان کا بس چلتا تو کھانے کے تمام اقسام سے اس کو سجا دیتے، بہت عمدہ باورچی اپنے یہاں ملازم رکھتے، ان کی دعوت قبول کرنے میں ہچکچاتا، ان کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھ کر اپنے کام و دہن کی لذت کی تسکین تو خوب ہو جاتی، لیکن ان کو اس کے لیے جھمیلوں کا جو سامنا کرنا پڑتا اس کو

سوچ کر تردد ہوتا، مگر ان کی زندگی کی ایک بڑی لذت یہی تھی کہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھ کر اچھا وقت گذاریں۔

یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی، اس موقع پر ان کی باتوں میں پہلے جیسی شگفتگی اور رعنائی نہ تھی، کچھ عرصہ پہلے ان کی رفیقۂ حیات کی رحلت ہو گئی تھی، ان کی دائمی جدائی پر برہان کے نظرات میں جو اپنے غم ناک جذبات ظاہر کیے تھے وہ سوگوارانہ رومانی ادب کا ایک شہ پارہ ہے، ان کے بڑے لڑکے کی وفات بھی ہو گئی تھی، ان کے ہمدم اور غمگسار مفتی عتیق الرحمٰن بھی حال ہی میں ان سے جدا ہو گئے تھے، پھر وہ یکایک یرقان میں مبتلا ہو گئے، ایک کتے نے بھی ان کو کاٹ لیا تھا، ان امراض سے وہ جاں بر تو ہو گئے تھے، لیکن صحت گر رہی تھی، اپنی ایک لڑکی کی پریشانیوں سے بھی پریشان تھے، مگر دلگیر اور دل فگار ہونے کے باوجود اپنی خوش طبعی کا کچھ نہ کچھ اظہار کرتے رہے، ان کی دو نواسیاں یونیورسٹی میں تعلیم پا رہی تھیں، وہ وہاں سے واپس آئیں تو ان کو دیکھتے ہی پکارا کہ آؤ! معارف کے شذرات یہاں بیٹھے ہیں، ان سے مل لو، ان سب کے ساتھ میں بھی ہنس پڑا۔

کچھ دنوں کے بعد خبر ملی کہ وہ اپنے علاج کے لیے پاکستان چلے گئے ہیں، ان کی خیریت ان کے داماد ڈاکٹر محمد اسلم شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے معلوم کرتا رہا، ۲۴ رمئی ۱۹۸۵ء کو یکایک ریڈیو سے سننے میں آیا کہ وہ اللہ کو پیارے ہو گئے،

اس خبر کو سنتے ہی آنکھوں کے سامنے فلمی پردہ کی طرح وہ آتے جاتے رہے، وہ آ رہے ہیں، وہ جا رہے ہیں، قدم قدم پر نئے نئے گل کھلا رہے ہیں، سیمینار میں بول رہے ہیں، کانفرنس میں مقالہ پڑھ رہے ہیں، اپنے دسترخوان پر طرح طرح کی چیزیں کھلا رہے ہیں، آہ! ان کی ملاقاتیں کیسی پُرکیف ہوتیں، ان میں گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح رنگینی اور عطر مجموعہ کی طرح شامہ نوازی ہوتی، ان کے قہقہے چہچہے، برجستہ اشعار، علمی نکات، ادبی مطائبات، اور دلچسپ مذاکرے اب کہاں سننے میں آئیں گے، ان کے ساتھ جو ساعتیں گذریں اب وہ کسی اور جگہ کہاں میسر ہوں گی، مگر اب ان کی یادوں کی جو تربت میرے دل میں بن گئی ہے، اس کے لوح تعویذ پر ان کی ساری باتیں کندہ ضرور نظر آئیں گی۔

آہ! ان کے بربطِ ہستی کا سرود اب خاموش ہے، علم کا ایک طائر ملکوتی عالم بقا کی فضائے بسیط میں پرواز کر گیا، اس برصغیر کا علمی حلقہ ایک باوقار اہل علم، ایک شگفتہ قلم اور ایک باوزن انداز بیان سے محروم ہو گیا، معاشرہ سے ایک خاص آب و رنگ کی شخصیت کی دلآویزی اور رعنائی چھین لی گئی، ان کے دوستوں کی بزم سے ان کے تفردات کی شیوہ بیانی اور شیریں گفتاری ختم ہو گئی، ان کے ہم جلیسوں پر ان کی قربت کا جو نشاط تھا وہ جاتا رہا، ان کی جبیں پر ان کی شگفتگی جو ہنستی رہتی، نہ اب ان کے ملنے والے کہاں دیکھیں گے، سلام علیك ورحمته الی یوم التلاق۔

اے ذوالجلال والاکرام! ان کی علمی خدمات کی بدولت جس سے انھوں نے بعض اسلامی روایات کو سربلند کرنے کی کوشش کی، ان کے ان دینی جذبات کی خاطر جن سے وہ کبھی بے حد مضطرب اور بے چین رہے، ان کی بے نفسی اور پاک طینتی کے بدلے میں جن سے وہ اپنے معاصروں میں مقبول رہے ان کو اپنی عاطفت کے سایے میں لے کر وہی جگہ عطا فرما جہاں تیری بے پناہ رحمت کا لازوال نور تاباں اور درخشاں رہتا ہے۔ آمین ثم آمین۔

بزمِ رفتگاں

یہ مصنف کے بعض بزرگوں، دوستوں، عزیزوں، معاصر دانشوروں، ادیبوں، مصنفوں، شاعروں اور سیاسی و قومی رہنماؤں کی وفات پر تاثراتی مضامین کا مجموعہ ہے، اس کے دو حصے ہیں، حصۂ اول مطبوعہ مکتبہ جامعہ ملیہ قیمت سترہ روپیے، حصۂ دوم مطبوعہ معارف پریس، قیمت سترہ روپیے، از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

"منیجر"

"معارف" کی ڈاک

مراد آباد ۲۲ جون ۱۹۸۵ء

محترمی! السلام علیکم

حضرت اقدس مولانا سید شاہ امان اللہ صاحبؒ پر جون کے معارف میں آپ کی دردو محبت بھری تحریر پڑھ کر جی چاہا کہ بندہ بھی حضرت کے تعلق کی کہانی تحریر کرے، اب سے ۵۰ سال قبل خواجہ حسن نظامی دہلویؒ نے منادی اخبار کے اپنے روزنامچہ میں پھلواری شریف کی حاضری کا حال تحریر کیا تھا کہ اس خانقاہ کے شیخ خانقاہ میں معتکف رہتے ہیں، صرف نماز اور مزارات پر حاضری دیتے ہیں، حج یا جہاد کے لیے صرف باہر سفر کی اجازت ہے، جس حجرے میں قیام رہتا ہے اس میں ایک تختہ داہنی طرف رکھا ہوا ہے جس پر وفات کے بعد ہر شیخ کو غسل دیا جاتا رہا ہے، حجرہ کے ساتھ ہی لگا ہوا چھوٹا سا حجرہ ہے جس میں غسل دیا جاتا ہے، ہر شیخ کا تکیہ انکی وفات کے بعد حجرہ میں جہاں شیخ تشریف فرما رہتے ہیں ان کی پشت کی طرف وہ تکیے سب جمع ہوتے ہیں، اسے پڑھ کر پھلواری شریف حاضری کا شوق پیدا ہوا، جب تبلیغی کاموں کے سلسلہ میں بہار جانا ہوا تو پھلواری شریف حاضر ہوا، اس وقت حضرت شاہ امان اللہ صاحبؒ گدی نشین ہو گئے تھے، پہلی حاضری کے بعد سلسلہ تعلق ایسا قائم ہوا کہ بندہ کئی بار حاضر ہوا، حجاز پاک میں بھی حضرت کے ساتھ رہا، خط و کتابت بھی ہوتی رہی خطوط اگر آپ معارف میں دینا چاہیں تو ارسال کر دوں گا، جب بھی حاضری ہوئی ملت کے حالات و مسائل پر خوب تفصیلی باتیں ہوتی رہیں، حضرتؒ کے مزاج میں حد درجہ سادگی، دردمندی اور ملت کی غمخواری چھائی ہوئی تھی، ایک دفعہ بندہ نے عرض کیا حضرت! بعض جگہ کے حضرات تبلیغی جماعتوں کو اپنی مسجد سے نکال دیتے ہیں، انکا

بڑی غم آمیز کیفیت سے فرمایا خود تو کچھ کرتے نہیں اور جو کر رہے ہیں انھیں کرنے بھی نہیں دیتے، مطالعہ بہت وسیع تھا، جب بھی حاضری ہوئی کسی کتاب کا ذکر نکلا تو حضرت نے یہی فرمایا کہ میں نے اس کا مطالعہ کر لیا، حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی صاحب کی شاید ہی کوئی کتاب ہو جو شاہ صاحبؒ کے مطالعہ میں نہ آئی ہو، عورت کتاب کے مسودہ کا مطالعہ فرمایا تھا، اس پر تحریر کیا تھا کہ تمھاری والدہ صاحبہ کے حالات بہت خوب ہیں، امریکہ بغرض علاج تشریف لے جاتے ہوئے بھی والا نامہ تحریر فرمایا تھا کہ دعائیں کی جائیں، ایک دفعہ تو خصوصیت سے طلب فرمایا کہ تجھ سے عرصہ ہوا ملاقات نہیں ہوئی، اس لیے آنے کی کوشش کر، چنانچہ بندہ حاضر ہوا اور خوب مسائل حاضرہ پر باتیں ہوتی رہیں، بتیا (چمپارن) کے تبلیغی اجتماع سے واپسی پر حضرت مولانا انعام الحسن صاحب امیر تبلیغ بھی پھلواری شریف تشریف لے گئے تھے، حضرت شاہ صاحب سے خوب ملاقات رہی، کھانا بھی خانقاہ میں نوش فرمایا، اس روز حضرت مولانا نے فرمایا تھا کہ جی چاہتا ہے آج خانقاہ ہی میں رہیے، مگر اس روز کئی جگہ کا پروگرام قبل سے بن گیا تھا۔

اب امارت شرعیہ کی کہانی سنیے، حضرت مولانا ابو الکلام آزادؒ کے مشورہ سے حضرت مولانا ابو المحاسن سجاد صاحبؒ نے جب بہار میں امارت کا نظام قائم فرمایا تو امیر شریعت کے منصب کے لیے مولانا محمد علی مونگیریؒ بانی ندوہ سے درخواست کی گئی، حضرت مونگیریؒ نے حضرت مولانا سید شاہ بدر الدینؒ کا نام تجویز کیا، حضرت کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے سید شاہ محی الدین صاحبؒ امیر بنائے گئے، ان کی وفات کے بعد ان کے چھوٹے بھائی سید شاہ قمر الدین صاحبؒ کو امیر بنایا گیا تھا، خانقاہ مجیبی نے تین امیر شریعت ملت بہار کو عطا فرمائے اور امارت کا مرکز بھی پھلواری شریف ہی میں قائم کیا گیا جو آج بھی ملت ہندیہ کی سب سے زیادہ عجیب و غریب اور گراں نعمت ہے۔

حضرت سید شاہ بدر الدین صاحبؒ نے اپنے بزرگوں کی وصیت کے مطابق تحریک خلافت کے دور میں سفر بھی فرمائے دعوت جہاد کے جذبے اور تقاضے سے۔

حضرت سید الملت کا ذکر خیر جب بھی حضرت شاہ صاحبؒ کے یہاں ہوا تو وہ اسی کیفیت کے ساتھ ہوتا تھا جیسے اپنے گھر کے بزرگوں کا ہوتا ہے۔

دیوبندی بریلوی کے المناک افتراق میں جس طرح ملت ہندیہ مبتلا ہے، اس کی صحیح رہبری کا روشن مینارہ خانقاہ مجیبیہ ہے، آج بھی حضرت سید شاہ عون احمد صاحب جمعیۃ علماء ہند کی مرکزی کمیٹی کے رکن رکین ہیں، ملت ہندیہ کے اکابر میں سے جو بھی جب کبھی خانقاہ مجیبیہ تشریف لے گئے، وہاں سے خوب متاثر ہوئے اور محبت کی خوشبو لیکر آئے، خانقاہ کے شیخ حاضر ہونے والے مہمانوں کی مدارات خوشبو سے بھرے ہوئے عطر سے کرتے ہیں۔

خانقاہ کی عمارت اور اس کا سارا ماحول دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جب خانقاہ کی تعمیر کی گئی ہوگی ایسی حالت میں قائم ہے کوئی تغیر، کوئی اضافہ اس میں نہیں کیا گیا، وہ اپنی قدیم دلآویزی کو خوب ظاہر کر رہی ہے، خدا کرے صاحبزادے مولانا رضوان اللہ صاحب سلمہ اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے یہاں مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ، دارالعلوم ندوہ، دارالمصنفین، امارت شرعیہ کا ذکر اپنے عزیزوں کی طرح ہوتا تھا۔

والسلام افتخار فریدی

کلکتہ ۳۰ رجون ۱۹۸۵ء

محترمی! السلام علیکم! کلکتہ ہائی کورٹ میں کلام مجید کے خلاف جو درخواست پڑی تھی اس پر آپ کے شذرات بہت ہی عمدہ اور طاقتور ہیں آپ نے مسلمانوں کے جذبات کی صحیح ترجمانی کی ہے، اس مقدمہ کی پیروی مغربی بنگال کی حکومت کی طرف سے میں نے سینیر گورنمنٹ ایڈووکیٹ کی حیثیت سے مغربی بنگال کے ایڈووکیٹ جنرل مسٹر ایس کے اچاریہ کے ساتھ کی، حکومت کی طرف سے سارے کاغذات میں نے ہی تیار کیے۔

کلکتہ ہائی کورٹ میں اسی قرآن کے مقدمہ کے سلسلہ میں ایک اور مقدمہ پیش ہوا، ۱۰ رجون ۱۹۸۵ء کو چندمل چوپڑا نے ایک درخواست اسی کورٹ میں پھر دی کہ اس کے اس مقدمہ پر نظر ثانی کی جائے جس کا فیصلہ ۱۷ مئی کو دیا گیا ہے، اسی روز مغربی بنگال کے ایڈووکیٹ جنرل کا ایک سفر انگلستان کا تھا، مجھ کو تنہا مغربی بنگال کی حکومت کی طرف سے اس مقدمہ کی پیروی کرنی پڑی، اس دوسری درخواست پر ۲۱ رجون کو فیصلہ دیکر اسکو نامنظور کر دیا گیا، اب خبر ہے کہ چندمل چوپڑا کی طرف سے کچھ روز میں ایک اور درخواست پڑے گی، یہ معاملہ یقیناً سپریم کورٹ تک جائیگا۔

مطبوعات جدیدہ

نورستان: از جناب حکیم محمد سعید صاحب، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت نہایت عمدہ، صفحات ۴۴۵ مجلد مع حسین گردپوش، قیمت اعلا ایڈیشن ۱۵۰ روپے، عام ایڈیشن ۵۰ روپے۔

پتہ: ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، ہمدرد سینٹر ناظم آباد، کراچی ۱۸۰۔

جسمانی امراض کے ماہر اور حاذق طبیب کی حیثیت سے حکیم حافظ محمد سعید کی شہرت تعارف سے مستغنی ہے، اس کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ روحانی امراض کے طبیب اور ملک و قوم کے مسیحا بھی ہیں، جو اپنی بیمار قوم و ملت اور مریض ملک و وطن کے لیے سخت فکرمند اور بے چین ہیں، چنانچہ انھوں نے اس میں قوم و ملک کی صحت و توانائی اور فلاح و بہبود کے لیے وہی پرانا نسخہ تجویز کیا ہے جس نے دور جاہلیت کے شرک و بت پرستی اور ظلمت و جہالت کا خاتمہ کر دیا تھا، ان کے خیال میں اس دور کے تمام مسائل کا حل بھی قرآن و سنت ہی سے ہو سکتا ہے، یہ کتاب حکیم صاحب کی نشری تقریروں کا مجموعہ ہے، جس کو مناسب ترتیب دے کر بہت قرینہ سے شایع کیا گیا ہے، اس میں وہ سب مفید اور ضروری باتیں بہت اچھے پیرایے اور دلکش انداز میں تحریر کی گئی ہیں، جو ملک و قوم کی روحانی، اخلاقی اور مادی ترقی کی ضامن ہیں، پہلے ایمانیات کے ضمن میں عقیدۂ توحید و آخرت، قرآن مجید اور رسالت محمدیؐ کا ذکر ہے، پھر عبد و معبود کے تعلق اور اللہ کے بندوں پر حقوق کا تذکرہ ہے، اس کے بعد رمضان المبارک کی اہمیت و خصوصیت اور قرآن مجید سے اس کی مناسبت بتائی گئی ہے، ایک حصہ میں علم و حکمت کی فضیلت کا

بیان ہے، پانچویں حصہ میں نفس وعمل کے تزکیہ، نیت وعمل کے اخلاص اور عمل کے محاسبہ پر بحث کی ہے، چھٹے عنوان کے تحت اسلامی تہذیب کے بنیادی عناصر بتائے ہیں اور اتحادِ امت، تعاون علی الخیر، امن، حریت، فلاحی ریاست کے تصور، انفاق فی سبیل اللہ اور اسلام کے نظامِ تعزیرات پر گفتگو کی ہے، ساتویں حصہ میں اسلام میں اجتماعیت کی اہمیت، معاشرتی آداب، لباس اور حقوق العباد کے متعلق اسلامی تعلیم وہدایت پیش کی ہے، اور زکوٰۃ کی معاشرتی ومعاشی حیثیت واضح کی ہے، ایک حصہ میں اخلاق کی اہمیت کے علاوہ بعض فضائل اخلاق کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے، اس کے بعد کے حصہ میں سماجی برائیوں اور رذائل اخلاق کا تذکرہ ہے، ایک حصہ مردِ مومن کے کردار اور خصوصیات کے لیے مخصوص ہے، آخر میں جسمانی صحت وتندرستی کی اہمیت کا ذکر ہے، اس سلسلہ میں بتایا ہے کہ صفائی اور پاکیزگی کی اسلامی تعلیم کا مقصد حفظانِ صحت بھی ہے، ریڈیائی تقریریں مختصر ہوتی ہیں، تاہم مصنف نے ہر موضوع سے متعلق اہم، ضروری اور مفید باتیں قلمبند کر دی ہیں، انھوں نے عام فائدہ اور تمام افرادِ ملت تک اپنی بات پہونچانے کی غرض سے زبان اور پیشکش کا دلچسپ اور آسان انداز اختیار کیا ہے، اور کہیں کوئی ایسی بات نہیں تحریر کی ہے جس میں کوئی ایچ پیچ ہو یا وہ عام لوگوں کی فہم سے بالاتر ہو، پوری کتاب سے حکیم صاحب کے دین ومذہب، قوم وملت اور ملک ووطن سے پُرخلوص ہمدردی اور خیر خواہی کا پتہ چلتا ہے، کاش ان کی قوم ان کی اس دردمندانہ پکار پر لبیک کہہ کر اپنی اصلاح وترقی کی طرف مائل ہو، یہ کتاب واقعی اسم بامسمّٰی ہے، اس کو پڑھ کر امتِ مسلمہ اس وقت جس ظلمت وتاریکی میں گھری ہوئی ہے، اس سے نکل کر روشنی اور اجالے میں آسکتی ہے، کتاب معنوی کی طرح صوری حیثیت سے بھی حکیم صاحب کی خوش مذاقی کی آئینہ دار ہے۔

"ض"

جلد ۱۳۶ ماہ ذی قعدہ وذی الحجہ ۱۴۰۵ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۸۵ء عدد ۲

مضامین